

GILLETTE & L'ORÉAL, WOMEN USA

Alabama • Alaska • Arizona • Arkansas • California
Colorado • Connecticut • Delaware



GILLETTE & L'ORÉAL, WOMEN USA — VOL. I

L'ORÉAL THROUGH GILLETTE · 00

امریکی سفر کا پہلا مرحلہ: الاسکا، ایریزونا، آرکنساس، کیلیفورنیا، کولوراڈو، کنیکٹیکٹ، ڈیلاویئر۔ آغاز باب صفر سے ہوتا ہے، وہ آرکٹک پیش لفظ جو اس سلسلے کی چھ کی چھ جلدوں میں مشترک ہے۔

باب صفر — مشترک آغاز

یہ ابتدائی باب *Women of the United States* کی چھ کی چھ جلدوں میں مشترک ہے۔ اسے یہاں پورا دیا گیا ہے، اور سمیٹ کر رکھا گیا ہے تاکہ سلسلہ بغیر تکرار کے ترتیب سے پڑھا جا سکے۔

باب صفر

یہاں دنیا کوئی خطہ نہیں: ایک حد ہے۔ قطب شمالی خوش آمدید نہیں کہتا، معاف نہیں کرتا، غلطی کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا۔ سفیدی ایک مطلق ہستی کی طرح راج کرتی ہے، خاموش اور بے حافظہ۔ درجہ حرارت کوئی موسمیاتی عدد نہیں: ایک شکاری ہے۔ رات مہینوں چلتی ہے، خیالات کو کچل دیتی ہے، لوگوں کے خدوخال بگاڑ دیتی ہے، اُن کا ارادہ نگل جاتی ہے۔

بستیاں کم ہیں، چھوٹی اور بند۔ انوٹ، یوپک، آرکٹک کی قومیں وہاں رہتی ہیں جہاں کوئی رہنا پسند نہ کرے۔ یہاں ہر فرد گروہ کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ اگر تم کام کے نہیں تو بوجھ بن جاتے ہو۔ اور جو بوجھ بن جاتے ہیں وہ خاموشی میں، برف میں، ایک ایسے ماحول کی منطق میں غائب ہو جاتے ہیں جو کوئی رعایت نہیں کرتا۔

سائنسی مراکز ایک اور طرح کی ٹھنڈک لے آتے ہیں: درجہ بندیوں کی۔ یہاں عورت کم ہی دکھائی دیتی ہے، ایک بے قاعدگی جسے ڈھلنا ہے یا ہار جانا ہے۔

اس جگہ "گمشدگی" کا تصور موجود ہی نہیں۔ صرف سفیدی ہے جو سب کچھ مٹا دیتی ہے۔

انوٹ اور یوپک عورتیں

آرکٹک کی لڑکی کو لاڈ نہیں کیا جاتا: تیار کیا جاتا ہے۔ وہ جلد ہی سردی، اندھیرے اور بھوک کو سہنا سیکھ لیتی ہے۔ اُسے قبیلے کے کام کا بننا ہے، کیونکہ یہاں شناخت ذاتی نہیں ہوتی۔ وہ کام سے بنتی ہے۔ عورت خاندان اور برادری کا بوجھ اٹھاتی ہے: کھانا، آگ، بچے، کھالیں، دیکھ بھال۔ کوئی حقوق کی بات نہیں کرتا۔ کوئی نزاکت کی بات نہیں کرتا۔ افسردگی موجود ہے، مگر اُس کا کوئی نام نہیں۔ تشدد موجود ہے، مگر اُس کا کوئی گواہ نہیں۔

سائنسی مراکز کی عورت

پڑھی لکھی، قابل، نظم و ضبط کی عادی۔ وہ محققہ، تکنیکی ماہر اور ڈاکٹر بن کر آتی ہے۔ جلد ہی جان لیتی ہے کہ قطب شمالی ڈگریوں کو نہیں مانتا۔ یہاں صرف ذہنی سختی کی قدر ہے۔ مردانہ درجہ بندیوں اُس پر حاوی رہتی ہیں، اور کمزوری کی ہر علامت کو کمزوری ہی سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایسا ماحول ہے جہاں طاقت کافی نہیں: انتہائی ضبط نفس درکار ہے۔

مغربی "باہر کی" عورت

آزادی میں پلی بڑھی، وہ یہ سمجھ کر آتی ہے کہ سردی کو فتح کر لے گی۔ مگر یہ جگہ اُسے توڑ دیتی ہے: تنہائی، تنگ جگہیں، نہ ختم ہونے والی خاموشیاں۔ مراکز برادریاں نہیں، مشینیں ہیں۔ اور مردوں کی بنائی ہوئی مشین کے اندر عورت کو غائب نہ ہونے کے لیے لڑنا پڑتا ہے۔

دنیا کے کنارے تک کا سفر

میرا پڑوسی انتونیو، جسے سب نینو کہتے تھے، برسوں سے نارتھ کیپ کی، آدھی رات کے سورج کی، اندھیرے کے بغیر مہینوں کی باتیں کرتا آیا تھا۔ یہ ایک خواب تھا جو اُس نے جیب میں سنبھال رکھا تھا، کسی ناممکن چیز کی طرح۔ مئی کی ایک صبح میں نے اُس کی گھنٹی بجائی اور صرف اتنا کہا: "سوٹ کیس باندھ لو۔ میں ایک گھنٹے میں واپس آؤں گا۔ ہم 30 دن میں

لوٹیں گے۔" اُس نے حیران، خوش ہو کر مجھے دیکھا۔ اُس کی بیوی نے فکر مند ہو کر پوچھا کہ ہمارا ارادہ کیا ہے۔ "ایک خواب کا پیچھا،" میں نے جواب دیا۔ ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ہماری بیویوں نے ہمیں یوں دیکھا جیسے ہم پاگل ہوں۔ مگر یہ سفر حقیقی تھا۔ نینو سوالوں سے بھرا ہوا تھا۔ "ہم کہاں جا رہے ہیں؟ کتنے پیسے ساتھ لوں؟" "آرام سے،" میں نے کہا۔ "ہم 54 گھنٹوں میں پہنچ جائیں گے۔ صرف 5000 کلومیٹر۔ ہم نئی Range Rover میں ہیں۔ سفر کا مزہ لو۔"

ہر 300 کلومیٹر پر مجھے رکتا پڑتا: وہ مجھ سے بارہ برس بڑا تھا، اُس کی اپنی رفتار تھی۔ میرے پاس پانی اور مشروبات تھے؛ اُس کے پاس کافی اور جسمانی حاجتیں۔ اور ہم جتنا آگے بڑھتے، وہ اتنا ہی اپنی زندگی کی باتیں کرتا۔ ایسی باتیں جو اُس نہ ختم ہونے والی سڑک کے بغیر میں کبھی نہ جان پاتا۔

گاڑی میں اکیلے دو مرد، ہمیشہ عورتوں کی باتیں کرتے ہوئے۔ وہ اپنی بیوی کے سوا کسی کو جانتا ہی نہ تھا۔ میں ہنس پڑا۔ میں نے اُسے تسلی دی: "ہم بھی ایسے ہی ہیں۔"

اُس نے پوچھا کہ 60 گھنٹے گاڑی چلاتے ہوئے میں ہوش میں کیسے رہ لیتا ہوں۔ میں نے اُسے روس کا قصہ سنایا، جب 22 برس کی عمر میں میں نے ایک ایسی عورت سے ملنے کے لیے 51 گھنٹے گاڑی چلائی تھی جسے میں کبھی ملا نہیں تھا۔ "فاصلے حد نہیں ہوتے،" میں نے اُس سے کہا، "بہانے ہوتے ہیں۔ میرے پاس کبھی کوئی بہانہ نہیں رہا۔"

سفیدی میں آمد

ہم ناروے میں داخل ہوئے۔ سڑک کنارے ایک ہوسٹل۔ گاڑی وہیں چھوڑ کر ہمیں سلیج پر آگے جانا تھا۔

گائیڈ سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی تھی، ناقابل رسائی۔ جب اُس نے عینک اتاری تو مجھے پتا چلا کہ وہ عورت ہے۔ ایک نارویجن عورت، خاموش، دو ٹوک، برفیلی۔ نینو سلیج کے بیچ میں، وہ آگے، اور میں، 190 سینٹی میٹر کا، سب سے پیچھے۔

ابھی دن کی روشنی تھی۔ میری گھڑی وقت بتا رہی تھی، مگر یہ نہیں بتا رہی تھی کہ رات ہے یا صبح۔ یہ آدھی رات کا سورج تھا۔ ہم نارتھ کیپ پہنچ گئے تھے۔

نینو رو پڑا۔ اُس نے مجھے گلے لگا لیا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا، ”دھیان سے... لوگ سمجھیں گے ہم گے ہیں۔“ ہم ہنس پڑے، مگر ہم دنیا کے کنارے پر تھے۔
پھر پالا آیا: C°52۔

اصل آرکٹک میں داخلہ

وہ ہمیں کپڑے بدلنے کے لیے دھات کے ایک کنٹینر میں لے گئے۔ انتہائی بھاری، گدے دار سوٹ، پیچیدہ زپوں سے بند۔

گائیڈ کی اجرت میں نے ادا کی۔ نینو کو کچھ مردوں کے ساتھ ایک اگلو میں چھوڑ دیا گیا؛ مجھے ایک خاندان کے ساتھ دوسرے میں: ایک بوڑھا آدمی، 70 اور 80 کے بیچ، اور تین عورتیں 30 اور 50 کے بیچ۔

یہ ایک بند دنیا تھی۔ سادہ۔ بے رحم۔

آدمی ایک طرف رہتا۔ عورتیں کام کی رفتار سنبھالے رکھتیں۔ اور بیت الخلا اگلو سے پانچ میٹر دور ایک ٹیلا تھا: پاخانہ زمین تک پہنچنے سے پہلے جم جاتا۔ میرا پہلا پیشاب ایک پیلا آرکٹک ستارہ بن گیا۔ یہ شمال تھا جو مجھے سلام کر رہا تھا۔

درمیانی عمر کی عورت، ماگی، تھوڑی بہت انگریزی بولتی تھی۔ باقی سب اشارے تھے، آنکھیں، ہاتھ۔ سردی کی زبان۔

جب مجھے سوٹ کے استعمال کا یقین نہ تھا تو اُس نے بلا سوچے میری ٹانگوں کے بیچ ہاتھ لگا کر مجھے ایک چھپی ہوئی زپ دکھائی۔ نہ کوئی بدنیتی تھی، نہ کوئی جھجک: صرف کام۔ بقا۔

اگلو میں تین دن

وہ کھانا لے آئیں۔ دھواں دی ہوئی مچھلی، کچی مچھلی، کوڈ کی کلیجی، وہیل کا پیٹ۔ اور شارک کے گولے۔ کوئی انتخاب نہ تھا۔ کوئی متبادل نہ تھا۔ یہ وہ تھا جو فطرت دیتی ہے۔

پھر میں نے پیا: ایک سرخ مائع۔ میں سمجھا شراب ہے۔ یہ چھانا ہوا، ابالا ہوا، میٹھا کیا ہوا وہیل کا خون تھا۔ میں نے پی لیا۔ اس نے مجھے ایسی طاقت دی جو میں نے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ ایک ازلی توانائی۔ میں سمجھا کوکین ہے۔ نہیں۔ یہ شمال تھا جو جسم میں داخل ہو رہا تھا۔

عورتیں مجھے دیکھتی رہتیں۔ بوڑھا شکار کو نکل جاتا۔ میں آرام کرتا اور خون پیتا۔ تین دن بغیر فون، انٹرنیٹ، کمپیوٹر کے، بغیر نینو کے۔ بس میں اور وہ۔

رات نہیں تھی۔ صرف روشنی، آگ، برف اور سانس۔

تینوں عورتیں سونے کو لیٹ گئیں۔ میں جگہ ڈھونڈنے لگا۔ سب سے چھوٹی نے بازو اٹھایا اور مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ میں سمجھا نہیں۔ اُنہوں نے کہا میں اُن کا ”کرسمس“ ہوں۔

یہ کہنے کا ایک انداز کہ مجھے قبول کر لیا گیا تھا۔

میں نے شکریے کے طور پر اُنہیں کچھ پیسے دینے چاہے۔ اُنہوں نے انکار کر دیا۔ اُنہیں بس ایک گلے ملنا چاہیے تھا۔ اور کالابریائی زبان کے چند الفاظ، تاکہ وہ قریب محسوس کریں۔

وہیں میں نے سچے تحفوں کی قدر سمجھی: وہ جو نہ خریدے جا سکتے ہیں نہ بیچے۔

گائیڈ کی رخصت

تین دن بعد گائیڈ آئی۔ وہ تینوں عورتوں سے ایک گھنٹہ باتیں کرتی رہی۔ میں باہر تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ یہ میرا معاملہ نہیں تھا۔ یہ اُن کی زبان تھی، اُن کی دنیا، اُن کا قانون۔

کنٹینر میں، جب میں کپڑے اتار رہا تھا، گائیڈ اندر آ گئی۔ متجسس۔ دو ٹوک۔ شمالی۔ اُس نے مجھے زور سے گلے لگایا۔ اُس نے مجھے چوما۔ اُس کی جلد دودھ جیسی سفید تھی۔ اُس کی آنکھیں اگست کے آسمان جیسی نیلی تھیں۔

اُس نے کہا مجھے ساتھ لے چلو۔ اُس دنیا سے نکلنے کے لیے وہ کچھ بھی کر گزرتی۔

میں احترام سے مسکرایا۔ میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

میں نے اُس کے پاس صرف ایک وعدہ چھوڑا: "اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے خط لکھ دینا۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔" اُس نے پیسے بھی لینے سے انکار کر دیا۔ وہ ایک خوبصورت عورت تھی، مگر تنہا۔ ایک ایسی تنہائی جو دور سے دکھائی نہیں دیتی۔ ایک ایسی تنہائی جسے سردی معاف نہیں کرتی۔

گھر واپسی

ہم نینو کو لینے گئے۔ وہ بے حد خوش تھا۔ وہ واپس جانا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اُس کی بیوی سے میرا وعدہ تھا۔

اُس نے سب کو اپنے تین دنوں کا حال سنایا۔ میں چپ رہا۔ میں نے اُس آدمی سے کبھی کچھ نہیں بانٹا۔ صرف کاغذ سے۔

اور یوں، جب نینو اپنی دنیا میں لوٹ رہا تھا، میں ایک اور دنیا کی راہ پر تھا۔ ایک اور منزل۔ ایک اور ملاقات۔

خوش آمدید۔

اختتامیہ

شمال تمہیں چھینتا نہیں: تمہیں بدل دیتا ہے۔ اور کبھی

تمہیں پورا واپس نہیں لوٹاتا۔ مرد قطب شمالی روشنی، خاموشی، تصویروں، خوابوں کی تلاش میں آتے ہیں۔ عورتیں بچے رہنے کے لیے ٹھہرتی ہیں۔

مرد وہ سناتے ہیں جو اُنہوں نے دیکھا۔ عورتیں اُس پر چپ رہتی ہیں جو اُن پر گزرا۔

مرد لوٹ جاتے ہیں۔ عورتیں رہ جاتی ہیں۔ وہ سردی میں رہتی ہیں، برف کے گھروں میں، آن سنی خاموشیوں میں۔ وہ اُن برادریوں کو سہارا دینے کے لیے رہتی ہیں جو اُن کا جشن نہیں مناتیں۔ وہ بچوں، بوڑھوں، اجنبیوں کی حفاظت کے لیے رہتی ہیں۔ وہ آن دیکھی رہتی ہیں۔

وہاں سے میں صرف ایک یاد لے کر آیا: ایک خوبصورت، بے حد خوبصورت عورت، مگر اکیلی۔ رومانوی معنوں میں نہیں۔ انسانی معنوں میں۔ المناک معنوں میں۔

غور و فکر

شمال جسم کو نہیں مارتا۔ موجودگی کو مارتا ہے۔ اور جو باقی رہ جاتا ہے وہ سفیدی ہے: ایک ایسی جگہ جہاں عورتیں ایک ہی وقت میں جیتی بھی ہیں اور غائب بھی ہو جاتی ہیں۔

اسی لیے میں لکھتا ہوں۔ کیونکہ انتہائی جگہیں اپنی کہانی خود نہیں سناتیں۔ اور جو اُن سے گزرتے ہیں وہ چپ رہنے کی عیاشی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

میں نہیں۔ میں نہیں۔ میری دھرتی نے مجھے جنم دیا، اور باقی دنیا مجھے مہمان کے طور پر نہیں بلکہ گھر کے ایک فرد کے طور پر قبول کرتی ہے۔

شمال کی مطلق سفیدی سے میں ریاست ہائے متحدہ کی مطلق الجھن میں اتر آیا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

ناممکن ذمہ داری

اٹھارہ برس ایک امریکی کمپنی کے لیے کام کرنا تمہیں وہ کچھ دیتا ہے جو دنیا کی کوئی اور کمپنی نہیں دے سکتی: کام کی ایک ثقافت، طریقہ کار، ایک واضح مشن، اور اقدار کا ایک نظام جو نظریہ نہیں—روزمرہ کا عمل ہے۔ وہ تمہیں یہ سمجھاتے نہیں؛ تمہارے اندر تعمیر کر دیتے ہیں۔ اور یہ کام تم سے اجازت لیے بغیر کرتے ہیں۔

میں نیویارک کے دفتر میں تھا جب مجھے ایک ایسے کام کی پیشکش ہوئی جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ ترقی نہیں۔ تبادلہ نہیں۔ ایک تجربہ۔

ایک خفیہ پروگرام، جو ریاست ہائے متحدہ کے اندر انسانی تعلقات کے ایک ماڈل کی توثیق کے لیے بنایا گیا تھا۔ اُنہوں نے مینیجروں، ماہرین نفسیات یا

تربیت کاروں کو نہیں چنا تھا۔ اُنہوں نے ایسے لوگ چنے تھے جن کے پاس حقیقی دنیا کا ایک خاص طرح کا تجربہ تھا۔ اور میرا نام سامنے آیا—حالانکہ میں اٹھارہ برس سے سیلز میں تھا۔ وہ عہدہ نہیں دیکھ رہے تھے: ذہن دیکھ رہے تھے۔

امتحان بیان کرنے میں سادہ اور پورا کرنے میں بے حد مشکل تھا:

ایک سال میں 50 امریکی ریاستوں کا دورہ کرنا، شہر خود چن کر اور ہر ایک میں کم از کم ایک ہفتہ ٹھہر کر۔

آخری دو ہفتے لازمی چھٹی ہوتی۔ سارا خرچ وہ اٹھاتے۔ مجھے بس جینا تھا، دیکھنا تھا، سمجھنا تھا، اور ہر پیر کو ایک رپورٹ دینی تھی۔ ایک انسانی، خشک، دقیق بیان۔

میں نے معاہدے پر دستخط کر دیے۔ گھر والوں کو اطلاع دی۔ اُنہوں نے کچھ نہیں پوچھا۔ وہ بس یہ جاننا چاہتے تھے کہ مہینے کا خرچ پہنچ گیا یا نہیں۔ میں امریکہ میں ایک سال کا سامنا کرنے جا رہا تھا۔ وہ، ہمیشہ کی طرح، اگلے مہینے کا سامنا کر رہے تھے۔

احتیاطاً میری تنخواہ سیدھی اٹلی میں میرے بینک اکاؤنٹ میں جمع ہوتی تھی۔ یہ مجھے شائستگی سے کہنے کا ایک طریقہ تھا: ”کوئی حماقت نہ کرنا۔ جو تمہارے پاس ہے اُسی میں جیو۔ دیکھتے ہیں تم اصل میں کون ہو۔“

صرف پندرہ برس بعد مجھے اپنی اصل رپورٹوں، تجزیوں اور اُس مواد تک رسائی ملی جو اُنہوں نے میرے بارے میں جمع کیا تھا۔ یہ کتاب وہیں سے پیدا ہوئی۔ مجھے اسے شائع کرنے کی منظوری ملی، ایک شرط پر: اُس کمپنی کا نام کبھی نہ لینا جس نے یہ کام کروایا تھا۔

کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ کہانی لوگوں کی نہیں۔ یہ ایک ایسے ملک میں ایک آدمی کی کہانی ہے جسے خود جیسے بغیر سمجھنا ناممکن ہے۔

کیا میں سب سے دور والے مقام سے شروع کروں؟

منطقی انتخاب یہ تھا کہ مرکز سے نہیں، کناروں سے شروع کیا جائے۔ دو سادہ وجوہات سے:

1. میں تجربے سے تازہ تازہ نکلا تھا: پوری بیداری، پوری توجہ۔

2. انتہا سے شروع کر کے میں راستہ درست کر سکتا تھا اور سفر صاف ستھرے انداز میں ختم کر سکتا تھا۔

مجھے بوسٹن یا شکاگو سے شروع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے ایک سرحد سے شروع کرنا تھا۔ ایک ایسی جگہ سے جو صرف کاغذ پر امریکہ تھی۔ میں نے جونو چنا، الاسکا کا دارالحکومت۔ الگ تھلگ۔ صرف کشتی یا ہوائی جہاز سے پہنچا جا سکنے والا۔ ایک شہر جو کسی کا نہیں۔ آغاز کے لیے بہترین جگہ۔

وسائل کا بہترین استعمال

روانگی سے پہلے میں نے وہ کیا جس کی ایک امریکی سب سے پہلے قدر کرتا ہے: میں نے سیاح کی طرح نہیں، پیشہ ور کی طرح تیاری کی۔ میں نے تین مقبول ترین ایئرلائنز کو فون کیا، وہ جن کا اندرون ملک سب سے بڑا جال ہے۔ ایک گھنٹے سے کم میں میں نے 60% رعایت پر پچاس اندرونی پروازوں کی ایک کتابچہ خرید لی۔

کوئی وقت کی حد نہیں۔ کوئی دنوں کی حد نہیں۔ کوئی پابندی نہیں۔ بس ایک شرط: ایک سال کے اندر استعمال کر لو۔

میں نے ہوٹلوں کی چینز، Uber ٹیکسیوں اور کار کرائے کی کمپنیوں کے ساتھ بھی یہی کیا، اور پھر مرحلوں کا، طریقوں کا، مگر اوقات کا نہیں، ایک باقاعدہ نظام الاوقات تیار کیا۔

میں تیار تھا۔

یہ میری پہلی حقیقی کامیابی تھی۔ پہلی علامت کہ مجھے حرکت کرنا آتا ہے۔ امریکہ عمل کرنے والوں کو انعام دیتا ہے، انتظار کرنے والوں کو نہیں۔

جب کمپنی نے یہ لین دین دیکھا تو اُس نے وہی کیا جو امریکی ثقافت ہمیشہ کرتی ہے: اعتبار کو جانچا۔

کیا میں ایک سال کی مسلسل نقل و حرکت سنبھال سکتا تھا؟ کیا میں اچانک واقعات، فاصلوں اور ہنگامی حالات سے نمٹ سکتا تھا؟ کیا میں خودمختار تھا؟

اسی لیے روانگی سے پہلے میں نے ایک اور اہم بات طے کی:
میں نے یقینی بنایا کہ میرے کریڈٹ کارڈ کی ماہانہ حد کم از کم ایک لاکھ
ڈالر ہو۔

یہ خرچ کرنے کے لیے نہیں تھی۔ یہ دکھانے کے لیے تھی کہ ہم اسے سنبھال
سکتے ہیں۔ امریکی ایسے ہی سوچتے ہیں: اگر تمہارے پاس خودمختاری نہیں
تو آزادی نہیں۔ اور اگر آزادی نہیں تو تمہاری جانچ نہیں ہو سکتی۔
اُس لمحے سے پروگرام ایک ذمہ داری نہیں رہا۔ ایک مشن بن گیا۔

اور اب سچ مچ سفر شروع

الاسکا صرف جغرافیے کے لحاظ سے ریاست ہائے متحدہ کا حصہ ہے۔ یہ ایک
اور دنیا ہے۔

یہ وہ جگہ ہے جہاں عورتیں بے نشان غائب ہو جاتی ہیں۔ جہاں کوئی
شکایت کبھی اپنی منزل تک نہیں پہنچتی۔ جہاں شہر ایک وحشی براعظم
کے بیچ محض مہذب جزیرے ہیں۔

جونو میرا پہلا امتحان تھا: ایک دارالحکومت جسے ملک کے باقی حصے سے
کوئی سڑک نہیں جوڑتی۔ امریکہ کا ایک ٹکڑا جو امریکہ جیسا نہیں لگتا۔
یہاں مجھے ایک بات سمجھ آنے لگی: یہ سفر جغرافیائی نہیں ہوگا۔ انسانی
ہوگا۔

بلاک 1 (جلد اول)

الاباما - الاسکا - ایریزونا - آرکنساس - کیلیفورنیا - کولوراڈو - کنیکٹیکٹ -
ڈیلاویئر - فلوریڈا - جارجیا

بلاک 2 (جلد دوم)

ہوائی - آئیڈاہو - الینوائے - انڈیانا - آئیووا - کنساس - کینٹکی - لوزیانا -
مین - میری لینڈ

بلاک 3 (جلد سوم)

میساجوسٹس - مشی گن - مینیسوٹا - مسیسیپی - میزوری - مونٹانا -
نیبراسکا - نیواڈا - نیو ہیمپشائر - نیو جرسی - نیو میکسیکو

بلاک 4 (جلد چہارم)

نیویارک - واشنگٹن

بلاک 5 (جلد پنجم)

نارتھ کیROLائنا - نارتھ ڈکوٹا - اوہائیو - اوکلاہوما - اوریگن - پنسلوینیا -
ریوڈ آئی لینڈ - ساؤتھ کیROLائنا

بلاک 6 (جلد ششم)

ساؤتھ ڈکوٹا - ٹینیسی - ٹیکساس - یوٹاہ - ورمونٹ - ورجینیا - ویسٹ
ورجینیا - وسکونسن - وائیومنگ الاباما صرف ریاست ہائے متحدہ کا
جنوب نہیں۔ یہ تاریخ کا ایک ٹکڑا ہے جو کبھی ٹھنڈا نہیں پڑتا۔ یہاں غلامی
کوئی باب نہیں: ایک سایہ ہے۔ نسلی علیحدگی کوئی یاد نہیں: ایک داغ
ہے۔ ایمان کوئی تسلی نہیں: ایک قابو ہے۔ اس ریاست میں ہر چیز بوجھ
ہے۔ گرمی بوجھ ہے۔ خاندان بوجھ ہے۔ روایت سب سے بڑھ کر بوجھ ہے۔
مذہب گلے کے گرد پٹے کی طرح کستا ہے۔ برادریاں دیکھتی ہیں، فیصلہ
سناتی ہیں، یاد رکھتی ہیں۔ کچھ بھی سچ مچ بھلایا نہیں جاتا۔ کچھ بھی
سچ مچ معاف نہیں کیا جاتا۔ اور اس سب کے بیچ عورتیں ہیں۔ عورتیں جو
نام لیے جانے کے بغیر پورے گھر چلاتی ہیں۔ عورتیں جو تین شفٹوں میں کام
کرتی ہیں اور بچوں کو تیار کرنے کے لیے پو پھٹتے اٹھتی ہیں۔ عورتیں جو اتوار
کو گرجا میں دعا کرتی ہیں اور پیر کو خاموشی میں کانپتی ہیں۔ عورتیں جن
کے شوہر کام سے نڈھال ہیں یا جن کے مرد کچھ نہیں کرتے۔ عورتیں جو ایک
ہی دن میں ماں، بیٹی، نانی دادی اور زندگی کا ستون بن جاتی ہیں۔

الاباما کی عورتوں کی زندگی ایک مسلسل پنڈولم ہے:

- کچھ ہیں جو جلدی گھر چھوڑ دیتی ہیں شادی کرنے، بھاگ جانے، وقت سے
پہلے بڑی ہو جانے کے لیے

— کچھ ہیں جو طلاق، چھنی ہوئی نوکری، دبائے ہوئے تشدد کی وجہ سے لوٹ آتی ہیں

یہ ڈھلی ہوئی عورتیں ہیں۔ نازک نہیں۔ باغی نہیں۔ مظلوم نہیں۔
ڈھلی ہوئی۔

اُن کی مزاحمت خاموش ہے، مگر مطلق۔ یہ اُن کی طاقت ہے جو ڈھے نہیں سکتیں کیونکہ کوئی اُنہیں اٹھائے گا نہیں۔

ڈائنر کی ویٹرس

کافی اور تلی ہوئی چیزوں کی بو تھی۔ اور مجھے فوراً ایک اصول یاد آیا جو ہر جگہ لاگو ہوتا ہے: جگہ جتنی غریب لگے، کھانا اتنا ہی اچھا۔ یہ سچائیاں میں نے سڑک پر سیکھیں۔ اور اس اصول نے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیا۔

اس کا نام کیڑول تھا۔

سنہرے بال—شاید قدرتی، شاید نہیں—گھسے ہوئے ہاتھ، جھٹ سے آنے والی مسکراہٹ، بجھی ہوئی آنکھیں۔ وہ سب کو ایک ہی تھکی ہوئی شائستگی سے کھانا دیتی تھی۔ اور کوئی اُسے سچ مچ دیکھتا نہیں تھا۔

میں دیکھتا ہوں۔ جب میں کسی فرشتے کو کام کرتے دیکھتا ہوں تو سلام کیے اور مسکراہٹ دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ کم سے کم ہے جو میں کر سکتا ہوں۔ وہ مجھے میز تک لے گئی۔ ”کیا کھائیں گے؟“ اُس نے پوچھا۔ اگر ہم اٹلی میں ہوتے تو میں اپنا سچ کہہ دیتا۔ میں نے پھر بھی کوشش کی:

”مجھے تم چاہیے ہو۔“

اُس نے مجھے خالی نظروں سے دیکھا۔ یا نہ سمجھنے کا ڈھونگ کرتے ہوئے—ان مقامی لوگوں کی طرح جو سب کچھ سمجھ لیں تو کہتے ہیں کچھ نہیں سمجھا۔ دہرانا بے کار تھا۔ تب میں نے آرڈر دیا:

ہاٹ ڈاگ۔ بیئر۔ اور ایک سیاہ امریکی کافی، میٹھے کے ساتھ۔

میں نے اُس کا تجسس جگا دیا تھا۔ اُس کی حرکات سے مجھے دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چند منٹ بعد لوٹی: ”میری شفٹ دس منٹ میں ختم ہوتی ہے...

کیا میں بیٹھ سکتی ہوں؟

میں نے ہامی بھر لی۔

وہ جھکی کمر کے ساتھ بیٹھ گئی، اُس کی طرح جو کبھی آرام نہیں کرتا۔
اُس نے میری آنکھوں میں دیکھا اور بغیر کسی ڈرامے کے کہا:

”میں یہ کام مجبوری میں کرتی ہوں۔ میرا شوہر عراق میں مارا گیا۔ نہ میرے
بچے ہیں، نہ رشتے دار۔ اور سڑک... وہ میرے بس کا کام نہیں۔“

میں نے جواب نہیں دیا۔ کبھی کبھی لفظ توہین ہوتا ہے۔ میں نے اُس کا ہاتھ
تھاما۔ ایک مضبوط دباؤ۔ ایک خشک، صاف اشارہ۔

اور اُس کی ہتھیلی پر میں سو ڈالر چھوڑ آیا۔

میں اٹھا۔ باہر نکل گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر۔ مگر شیشے کے پار میں نے
اُسے دیکھا۔ وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی تھی، جیسے حیران ہو، جیسے زخمی
ہو، جیسے شکرگزار ہو۔ وہ کچھ ہکلا رہی تھی جو باہر تک نہیں پہنچ رہا تھا۔

اور وہیں مجھے کیرول کی زندگی کا سچ سمجھ آیا:

وہ کبھی نہیں بیٹھتی۔

گوسپل گلوکارہ

یہ ایک عام سا اتوار تھا۔ مجھے اپنے روحانی وجود کو چھونے کی ضرورت
محسوس ہوئی، اور الاباما میں اس کا مطلب ہے گرجا جانا۔ وہاں ایمان
مذہب نہیں: ایک اسٹیج ہے۔

پادری اپنا وعظ ختم کر رہا تھا جب میں صدر دروازے سے اندر داخل ہوا، جو
گرمی کی وجہ سے پورا کھلا چھوڑا گیا تھا۔ میں نے کوئی بغلی دروازہ نہیں
چنا۔ میں چاہتا تھا کہ اُس چھوٹی سی برادری میں میری آمد محسوس کی
جائے۔

اُس نے مجھے دیکھا اور بلند آواز سے کہا، ”خوش آمدید، اجنبی۔“ میں نے
جواب دیا، ”آپ کو بھی خوش آمدید۔“

میں بیٹھ گیا۔ آرگن تھرتھرانے لگا: ایک تیز، مانوس آواز، وہ "امریکی بھوت" جو مجھے اریٹھا فرینکلن کی یاد دلاتا ہے چاہے کوئی مشہور نہ ہو۔ اور پھر وہ داخل ہوئی۔

اُس کی آواز گا نہیں رہی تھی: آزاد ہو رہی تھی۔

وہ افریقی امریکی تھی، اُن میں سے نہیں جو نظر انداز ہو جاتی ہیں، بلکہ اُن میں سے جنہیں قسمت صرف ایک بار تمہارے سامنے لاتی ہے یہ یاد دلانے کے لیے کہ جب زندگی انسان کو کچل دے تو وہ کیا کر سکتا ہے۔ اُس کی آواز بہت بڑی تھی۔ اُس کی زندگی چھوٹی تھی۔ وہ اتوار کو سانس لینے کے لیے گاتی تھی۔ سارا ہفتہ زندہ رہنے کے لیے چپ رہتی تھی۔

جب یہ ختم ہوا تو لوگ جانے کو اٹھ کھڑے ہوئے، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میں قریب گیا۔ وہ حیران ہوئی: وہاں کوئی گوسپل گلوکارہ کا شکریہ ادا نہیں کرتا تھا۔ یہ ہوا کا شکریہ ادا کرنے جیسا ہے: سب اسے معمول سمجھتے ہیں۔

میں نے اُس سے ہاتھ ملایا۔ میں نے ایک چھوٹا سا پیالہ دیا، اُس طرح کا جو معزز عورتوں کے لیے رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ اُس کے پاس سب کچھ تھا، یا تقریباً سب کچھ۔ اُسے بس میری ضرورت تھی۔ اور ایک منٹ کے لیے میں وہاں تھا۔

"آپ کون ہیں؟" اُس نے پوچھا۔ میں نے جواب دیا، "میں اُن فرشتوں میں سے ایک ہوں جو صرف تمہارے لیے چھت سے اترے ہیں۔ اور تمہاری بدولت آج میں انسان رہتا ہوں۔ میں کبھی واپس نہیں جاؤں گا۔"

وہ مسکرائی۔ اچھی علامت۔ میں کچھ بیچ نہیں رہا تھا۔ کچھ ڈھونڈ نہیں رہا تھا۔ میں جذب کر رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح۔

اُس کا تجسس ایک سوال بن کر پھٹنے والا تھا، مگر میں پہلے ہی دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور پھر وہ ہوا۔

اُس کی آواز نے مجھے پکارا: "سر! سر! اجنبی!" ایک بلند پکار، ہوا سے بھری اور کسی ایسی چیز سے جو درد نہیں تھی۔

میں نہیں مڑا۔ میں مدد کی پکار اور ”کیوں“ کی پکار میں فرق کر سکتا ہوں۔ وہ ایک ”کیوں“ تھا۔ اور اُسے جواب کی ضرورت نہیں تھی۔ میرا نذرانہ اُس کے قدموں میں رہ گیا۔ یہ میری نشانی تھی۔ باقی زندگی کے بارے میں وہ خود لکھتی، جس پر کبھی کسی نے تالی نہیں بجائی۔

کالج کی طالبہ

وہ کتابوں اور باریک امتیاز کے بیچ جیتی تھی۔ میں کیمپس کے باہر بیٹھا ایک سابق ساتھی کا انتظار کر رہا تھا جو وہاں پروفیسر بن چکی تھی۔ کیمپس بھاگتے، ہنستے، یہ ظاہر کرتے بچوں سے بھرا تھا کہ کوئی انہیں نہیں دیکھ رہا۔ وہ نہیں۔ وہ دیکھ رہی تھی۔

جب میری سابق ساتھی آئی تو اُس نے مجھے زور سے گلے لگایا۔ طالبہ نے یہ منظر دیکھا۔ اُس نے نظریں نہیں ہٹائیں۔ اور جب میں گلے کا جواب دے رہا تھا، میں اُسے دیکھ رہا تھا۔ صرف اُسے۔

استانی کو جلدی میں اپنے اور کاموں پر جانا پڑا۔ وہ ایک جلدی کی الوداع اور یادوں بھری فضا کے ساتھ مجھے صحن کے بیچ چھوڑ گئی۔ میں جا کر فوارے کے کنارے، طالبہ کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ مسکرائی۔ ان مسکراہٹوں میں سے ایک جو نہ دعوت ہوتی ہیں نہ دفاع: سچ ہوتی ہیں۔

”تمہارے خواب کیا ہیں؟“ میں نے اُس سے پوچھا۔ ”تم جوان ہو، ذہین ہو... اور کمبخت خوبصورت ہو۔“

وہ شرمائی نہیں۔ اترائی نہیں۔ اُس نے مختصر جواب دیا، اُس کی طرح جس نے حقیقت کے ساتھ جینا سیکھ لیا ہو:

”میں جنوب سے بھاگ نکلنے کا خواب دیکھتی ہوں۔“

مگر جنوب ہر جگہ میرا پیچھا کرتا ہے۔

میں نے سر ہلایا۔ ”جانتی ہو میں کہاں سے ہوں؟“ اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”جنوبی اٹلی سے۔“ وہ ایک لمحے کو رکی۔ پھر ہنس پڑی۔ ایک مختصر ہنسی، اُس طرح کی جو بوجھ میں ایک کھڑکی کھول دیتی ہے۔

ہم نے کم بات کی۔ مگر کافی تھی۔

”ہم شناخت، ماضی اور توقعات سے لڑنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں،“ میں نے اُس سے کہا۔ ”ہم ہمیشہ دوسروں سے بدلنے کو کہتے ہیں، مگر سچی تبدیلی اپنے اندر سے شروع ہوتی ہے۔“

وہ جوان تھی۔ مگر جو بوجھ وہ اٹھائے ہوئے تھی وہ جوان نہیں تھا۔ اور وہ اُسے وقار سے اٹھائے ہوئے تھی۔

جانے سے پہلے میں اُس کے پاس کچھ ایسا چھوڑنا چاہتا تھا جو نہ تقریر ہو نہ وعدہ۔ بس سچ۔

”یاد رکھنا، عزیزہ:

جنوب شمال کے لیے وہی ہے جو عورت مرد کے لیے ہے۔“

اُس نے مجھے دیکھا۔ وہ سمجھ گئی۔ اور کچھ درکار نہیں تھا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”خدا حافظ۔ اور قسمت ساتھ دے۔“

اُس نے جواب نہیں دیا۔ بس مسکرائی۔ اور اُس مسکراہٹ میں پورے کیمپس سے زیادہ مستقبل تھا۔

جدید پلانٹیشن کی عورت

میری ریاستی چیمبر آف کامرس کے صدر سے ملاقات طے تھی۔ میں اس سے پہلے اٹلی میں کونسلر رہ چکا تھا، اور کچھ ادارہ جاتی طور طریقے، جیسے ہی تم اُنہیں دوبارہ دیکھو، فوراً ذہن میں لوٹ آتے ہیں۔ وہ لمبا، دبلا اور نفیس تھا۔ سونے کی گھڑی۔ پرانی دولت کی ہلکی سی خوشبو۔ اُس طرح کی جس کی نمائش نہیں کی جاتی: جو پہنی جاتی ہے۔ کیونکہ یہاں کے امیروں سے پیسے کی بو نہیں آتی۔ اُن سے ہر چیز کی بو آتی ہے۔

اُسے اپنی ریاست پر فخر تھا۔ حد سے زیادہ فخر۔ اس یقین کے ساتھ کہ الاباما کی معیشت پوری قوم کو سہارا دیتی ہے، اُس نے اسے ثابت کرنے کے لیے مجھے کپاس کی ایک پلانٹیشن پر لے جانے کا فیصلہ کیا۔ پہلے زمین۔ پھر پروسیسنگ۔ پھر جدید زرعی صنعت، وہ جس نے زنجیریں تو اتار دیں مگر وہی تال باقی رکھی۔

اور وہیں میں نے اُسے دیکھا۔

دھوپ اُس کی پیٹھ جلا رہی تھی۔ اُس کی حرکات بے حد سست، دقیق، بغیر کسی شکوے کے۔ وہ بھرپور جوانی کے بعد کی عمر کی ایک عورت تھی، ایسے چہرے کے ساتھ جو تھکنے تراشا لگتا تھا۔ کندھوں پر اُس کا خاندان۔ جلد پر لکیریں۔ آنکھیں سخت۔ اُس کی رفتار جو کبھی، کبھی بھی خود کو غلطی کی اجازت نہیں دیتی۔

میں نے صدر سے پوچھا کہ کیا میں مزدوروں سے بات کر سکتا ہوں۔ میں ”بہتر سمجھنا“ چاہتا تھا، میں نے کہا۔ ایک بہانہ۔ میں بس اُس سے بات کرنا چاہتا تھا۔

میں قریب گیا۔ اُس نے گھٹنے ٹیکے اور میرا ہاتھ چوما۔ ایک قدیم اشارہ، بے جگہ، بے وقت۔ میں نے اُسے فوراً روک دیا۔

”اٹھ کھڑی ہو،“ میں نے اُس سے کہا۔ ”میں کوئی ہشپ نہیں۔ نہ کوئی پوپ۔ میں تمہاری طرح بس ایک انسان ہوں۔“

اُس نے جواب نہیں دیا۔ اُس نے مجھے بمشکل دیکھا، جیسے وہ دیکھتے ہیں جو سچ مچ دیکھنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ میں چند لمحے خاموش رہا۔ پھر چلا گیا۔ مگر بات ختم نہیں ہوئی تھی۔

اگلے دن میں اکیلا لوٹا۔ میں اُسے اپنے گرد سیاسی تماشے کے بغیر دوبارہ دیکھنا چاہتا تھا۔

میں نے مزدوروں کے باہر آنے کا انتظار کیا۔ جب اُس نے مجھے دیکھا تو نظریں جھکا لیں۔ شرم۔ احترام۔ اور بولنے کی ایک دبی ہوئی خواہش۔

میں نے کچھ مسلط کیے بغیر ایک دھیمے اشارے سے اُسے روکا۔ وہ جنوب کے چہرے ہوئے تسلسل کا چہرہ تھی: وہ قدیم مشقت جو کبھی مٹی نہیں۔ بس بہتر چھپا دی گئی ہے۔

میں نے اُس کا ہاتھ تھاما۔ میں نے اُسے پادرے پیو کی ایک چھوٹی سی تصویر دی جو میں ہمیشہ ساتھ رکھتا ہوں۔ پیچھے میں نے لکھا تھا:

”درد گزر جانے سے بھولا نہیں جاتا۔“

وہ صرف تب بھولتا ہے جب تم معاف کر دو۔“

میں نے اور کچھ نہیں کہا۔ ضرورت نہیں تھی۔ اُس نے ایک چھوٹے سے اشارے سے سر ہلایا، جو دوسروں کو دکھائی نہ دیا۔ مگر میرے لیے وہی سب کچھ تھا۔

اختتامیہ - الاباما

الاباما کوئی ریاست نہیں: ایک فیصلہ ہے۔ ایک ایسی جگہ جہاں ماضی گزرتا نہیں اور حال اجازت نہیں مانگتا۔ سب کچھ اب بھی دو سطروں پر لکھا ہے: کون کھڑا رہتا ہے اور کون گرتا ہے۔ اور ہمیشہ، جو کھڑی رہتی ہے وہ ایک عورت ہے۔

میں نے چار مختلف چہرے دیکھے مگر سچ ایک: ویٹرس جو کبھی نہیں بیٹھتی، گوسپل گلوکارہ جو سانس لینے کے لیے گاتی ہے، طالبہ جو اُس جنوب سے بھاگنے کا خواب دیکھتی ہے جو اُس کا پیچھا کرتا ہے، نئی پلانٹیشنوں کی مزدور، ایک قدیم مشقت کی وارث۔ چار کہانیاں۔ ایک جڑ۔ ایک ہی خاموش جنگ۔

الاباما میں عورت ایک ایسے ایمان کے اندر جیتی ہے جو حفاظت بھی کرتا ہے اور سزا بھی دیتا ہے، ایک ایسے خاندان کے اندر جو سہارا بھی دیتا ہے اور دم بھی گھونٹتا ہے، ایک ایسی برادری کے اندر جو دیکھتی بھی ہے اور فیصلہ بھی سناتی ہے۔ پھر بھی وہ ڈٹی رہتی ہے۔ ہار نہیں مانتی۔ ٹوٹتی نہیں۔ صفائیاں نہیں دیتی۔

مرد اپنے جنوب کو فخر کا ذریعہ بتاتے ہیں۔ عورتیں اُسے ایک امتحان کی طرح جیتی ہیں۔

غور و فکر - الاباما

سچ سادہ ہے: جہاں مرد نام کی نمائش کرتا ہے، وہاں عورت دنیا پر حکومت کرتی ہے۔

الاباما نے مجھے سکھایا کہ کچھ زندگیوں کو چرخے کے لیے آواز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انہیں کسی ایسے کی ضرورت ہوتی ہے جو سنے۔ اور میں نے، ایک بار پھر، وہی کیا جو مجھے آتا ہے: گزرنا، دیکھنا، سمجھنا، اور پھر کسی کو پریشان کیے بغیر چلے جانا۔

کیونکہ امریکی جنوب کا، گلوبل ساؤتھ کی طرح، ایک اصول ہے جو صدیوں سے قائم ہے: جو وہاں رہتے ہیں وہ نہیں بدلتے۔ جو انہیں دیکھتے ہیں وہ بدل جاتے ہیں۔

میں نے اسے دیکھا۔ اور میں ویسا نہیں رہوں گا۔

الاسکا

الاسکا ایک ریاست نہیں: یہ ایک زندہ سرحد ہے۔ ایک براعظم جتنا بڑا علاقہ، جہاں انسان مہمان ہے اور فطرت فیصلہ کرتی ہے۔ ایسے شہر ہیں جو صرف ہوائی راستے سے جڑے ہیں۔ ایسے گاؤں جو مہینے میں ایک بار ڈاکٹر دیکھتے ہیں۔ ایسے گھر جہاں بجلی عیاشی ہے اور گرم پانی ایک مراعت۔ یہاں سردی موسم نہیں: یہ ایک کردار ہے۔ یہ لوگوں کو تراشتی ہے، عادتوں کو ڈھالتی ہے، خاموشی مسلط کرتی ہے۔ زندگی ناممکن فاصلوں، سخت محنت، اور ایسی تنہائی سے بنی ہے جو گہرائی تک کھودتی ہے اور ہمارے بولنے، محبت کرنے اور زندہ رہنے کا ڈھنگ بدل دیتی ہے۔

مقامی برادریاں صدیوں کی روایات اٹھائے ہوئے ہیں۔ عورتیں ان کے ستون ہیں: وہ گھر سنبھالتی ہیں، بچوں کو پالتی ہیں، اور برادری کو جوڑے رکھتی ہیں۔ لیکن وہ آواز نہیں ہیں۔ اکثر ان کے پاس یہ بتانے کی جگہ نہیں ہوتی کہ وہ کیا سہتی ہیں۔

شہروں میں — اینکریج، فیئر بینکس، جونو — دنیا تیز چلتی ہے، مگر تنہائی وہی رہتی ہے۔ عورتیں کام، آزادی، مستقبل کی تلاش میں آتی ہیں۔ بہت سی مضافات میں، تیل کمپنیوں کی شفٹوں میں، برے رشتوں میں، اداروں کی خاموشی میں نگل لی جاتی ہیں۔

الاسکا میں جب کوئی عورت گرتی ہے تو آواز کہیں نہیں پہنچتی۔ سردی سب کچھ ڈھانپ لیتی ہے۔ اور جو غائب ہو جاتا ہے، غائب ہی رہتا ہے۔

ٹیکسی چلانے والی عورت

ہوائی اڈے سے ہوٹل تک کا سفر کافی تھا۔ برفیلی سڑک پر پینتالیس منٹ، اور چالیس برس کی ایک بیوہ نے ایک لمحے کے لیے بھی مجھ سے باتیں کرنا بند نہ کیا۔ الاسکا میں ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے: لوگ اکیلے رہتے ہیں، لیکن

جب انہیں کوئی سننے والا ملتا ہے تو وہ یوں کھل جاتے ہیں جیسے یہ ان کا آخری دن ہو۔

میں نے طے کر رکھا تھا کہ اس پورے سفر میں میں ایک ادیب رہوں گا۔ نہ کوئی عہدہ، نہ کوئی کمپنی، نہ کوئی امتحان۔ میں گمنام رہا، کیونکہ سچ یہ ہے کہ مجھے خود بھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ میں کیا ڈھونڈ رہا ہوں۔ بس اتنا جانتا تھا کہ کوئی مجھے ایسی چیز سمجھنے کے پیسے دے رہا ہے جو وہ کہہ نہیں رہے تھے۔ اس نے معمول کے سوالوں سے شروع کیا: عمر، کام، کیا میں شادی شدہ ہوں، کیا میرے بچے ہیں۔ میں نے بس جواب دیا، ”میری مانگنی ہو چکی ہے۔“

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اور الاسکا میں ہنسی کسی عورت کے اعتماد کا پاسپورٹ ہے۔ اسی لمحے میں اس کی دنیا کے اندر تھا۔

ہم ہوٹل پہنچے۔ اس نے گاڑی کھڑی کی اور میرا سوٹ کیس لے کر مجھے کمرے تک چھوڑنے کا بہانہ ڈھونڈ لیا۔ مجھے فوراً ایک بات سمجھ آ گئی: جب عورت کچھ چاہتی ہے تو مانگنی نہیں لے لیتی ہے۔

یہ پہلا اشارہ تھا کہ مجھے محتاط رہنا ہے۔ اس میں خطرہ نہیں تھا، احترام تھا: الاسکا میں رات کو اکیلے گاڑی چلانے والی عورت چالیس برس تک زندہ نہیں رہتی جب تک وہ مردوں کو کسی اور سے بہتر پڑھنا نہ سیکھ لے۔

ہم دوست رہے۔ آج بھی ایک دوسرے کو لکھتے ہیں۔ وہ مشورہ مانگتی ہے، اور ہر بار ایک ہی جملہ دہراتی ہے:

”تمہارے پاس سب کے مسئلوں کا حل ہے، مگر اپنے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ تمہارے پاس مواقع ہیں۔“

ایک عورت جو زندہ رہنے کے لیے یخ بستہ سردی میں گاڑی چلاتی ہے۔ اور جس نے دوسروں کو اس سے زیادہ سمجھنا کبھی نہیں چھوڑا جتنا انہوں نے اسے کبھی سمجھا۔

سرحدی پولیس والی عورت

صبح میں چہل قدمی کے لیے نکلا۔ سفر میں میں ہمیشہ یہی کرتا ہوں: اپنے کاغذات اور بٹوہ ہوٹل میں چھوڑ دیتا ہوں، اور صرف ہوٹل کا کارڈ ساتھ

رکھتا ہوں۔ یہ برسوں پرانی عادت ہے۔ میں گھروں کو، سردی کو، الاسکا کی خاموشی کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک، بغیر کسی اطلاع کے، پولیس کی دو گاڑیاں آ پہنچیں۔ دو خاتون افسر لپک کر باہر نکلیں، ٹریفک روکی، پبلی پٹی بچھائی، اور ایک حصے کو یوں گھیر لیا جیسے ابھی ابھی کوئی قتل ہوا ہو۔ میں کھڑا دیکھتا رہا، مگر چند سیکنڈ بعد ان میں سے ایک نے مجھے حکم دیا کہ جہاں ہوں وہیں رہوں۔ وہ مجھ سے گواہ کے طور پر پوچھ گچھ کرنا چاہتی تھیں۔

کس بات کا گواہ؟

میں نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ میں تو بس ایک آدمی تھا جو چہل قدمی کر رہا تھا۔

”معاملہ“ یہ تھا: ایک کتا دم گھٹنے سے مر گیا تھا۔ کسی نے اسے پانی کے بغیر ہاٹ ڈاگ کھلا دیے تھے۔ الاسکا میں یہ بھی جرم ہے۔

اس لمحے مجھے لگا کہ میں کسی فلم کے سیٹ پر آ گیا ہوں۔ مگر یہ حقیقت تھی۔ یہ الاسکا تھا۔ اور میں وہاں تھا۔

انہوں نے مجھے اپنی گاڑی میں بٹھایا اور کاغذات لینے کے لیے واپس بوٹل لے گئیں۔ ان دونوں میں سے ایک اچھی فرانسیسی بولتی تھی اور اسی زبان میں مجھ سے سوال کرنے لگی۔

کتا مر چکا تھا۔ قصوروار کو ڈھونڈنا تھا۔ میں وہاں موجود تھا، اس لیے پوچھ گچھ کے لیے حاضر تھا۔

میں نے کہا کہ مجھے جانوروں سے محبت ہے۔ کہ اٹلی میں میرے دو ہیں۔ اور یہ، اُس ناقابل فہم شمالی امریکی منطق میں، مجھے ”مشکوک نہیں“ سمجھنے کے لیے کافی تھا۔

تناؤ کم ہوا۔ رسمی کارروائیاں ہوا ہو گئیں۔ اور رات کے کھانے کی دعوت آ گئی۔

پولیس والی، وردی کے بغیر، اپنے اندر ایسی آگ رکھتی تھی جس کی برف کے بیچ توقع نہیں ہوتی۔ میکسیکن یا ہسپانوی عورتوں کے بارے میں گھسے پٹے

تصویرات بھول جائیں: الاسکا کی عورتیں بقا کے لیے گرم ہیں، کھیل کے لیے نہیں۔

کھانا سادہ، سیدھا اور بے تکلف تھا۔ میرے لطیفوں نے اسے ایسا ہنسایا جیسے وہ برسوں سے نہ ہنسی ہو۔ یہاں، ایسی دور دراز جگہوں پر، ہنسی ایک نایاب جنس ہے۔

آخر میں ہم نے بغیر کسی وعدے یا توقع کے خدا حافظ کہا۔ صرف ایک چیز باقی رہی، مضبوط اور تیز:

خاموشی۔

وہ خاموشی جو الاسکا میں ہر کہانی کے بعد ہمیشہ آتی ہے۔ اور جو برف سے زیادہ بھاری ہوتی ہے۔

یونیورسٹی کی لڑکی

میں نے ہوٹل میں پوچھا تھا کہ لائبریری کہاں ہے۔ میرے لیے یہ ہمیشہ ایک مثالی جگہ رہی ہے: اندر خاموشی، باہر الفاظ۔ ایک ایسی جگہ جہاں لوگ سکون کا لباس پہن لیتے ہیں، اور دروازے سے نکلتے ہی پھر پہلے جیسے ہو جاتے ہیں۔

میری نظر فوراً ایلگا پر پڑی — سیکریٹری۔ اس نے سرخ فریم والی جدید عینک پہن رکھی تھی۔ ایک ایسی تفصیل جو شمال کی کسی عورت پر انداز، کردار اور فطری دلکشی کا پتا دیتی ہے۔ میں نے اسے کافی کے وقفے کی دعوت دی۔ اس نے دوسری بار نہیں سوچا: لائبریری کو تالا لگایا اور ہم نکل پڑے۔

ہم بس اسٹاپ پر پہنچے، مگر ہماری بس چند منٹ پہلے جا چکی تھی۔ ایک کال جو کبھی ملی نہیں۔ ایک چھوٹی ہوئی ٹرین۔ اُن چھوٹی چھوٹی دراڑوں میں سے ایک جو موقع بن جاتی ہیں۔

اس نے ہمت نہ ہاری۔ اس نے میرا بازو یوں تھاما جیسے مجھے برسوں سے جانتی ہو اور مجھے اپنے گھر لے گئی۔ اس نے انگریزی چائے بنائی، بسکٹ رکھے، ایک سادہ، تقریباً بچکانہ سی خاطر داری۔ میں وہ اطالوی تھا جو اتفاق سے وہاں آ نکلا تھا، وہ یونیورسٹی کی ایک نوجوان طالبہ تھی جو

مستقبل کا ایک ٹکڑا ڈھونڈ رہی تھی۔ اُس چھوٹے، صاف ستھرے کمرے میں مجھے ایک بات سمجھ آئی: الاسکا میں مہربانی ایک مختصر اشارہ ہے۔ ایک فوری عمل۔ یہ تکلف نہیں: یہ ضرورت ہے۔

وہ شوہر کی تلاش میں تھی۔ اس نے کہا نہیں، مگر اس کی ہر حرکت سے ظاہر تھا۔ میں نے وہی کیا جو مجھے واقعی آتا ہے: اسے کچھ مشورہ دیا۔ اس کا ہاتھ تھامنے والا میں نہیں تھا۔ میں دنیا میں دینے آیا ہوں، لینے نہیں۔ اور وہ میرا وقت نہیں تھا۔

تین برس بعد مجھے ایک ای میل ملی۔ ایک تصویر۔ وہ، گود میں ایک بچہ لیے۔ اور ایک ہی جملہ:

”میں نے اس کا نام تمہارے نام پر رکھا۔“

محبت کی وجہ سے نہیں۔ احترام کی وجہ سے۔“

ایک ایسے ملک میں جہاں پالا سب کچھ ڈھانپ لیتا ہے، کبھی کبھی ایک چھوٹا سا اشارہ ایسا نشان چھوڑنے کے لیے کافی ہوتا ہے جو کبھی نہیں پگھلتا۔

گھریلو خاتون

مجھے احساس ہوا کہ میں اپنی خوراک کی پابندی چھوڑ رہا ہوں۔ دن میں صرف ایک بار کھانا سفر میں ٹھیک تھا، مگر الاسکا جیسی جگہ میں نہیں، جہاں سردی اجازت مانگے بغیر تمہیں کھا جاتی ہے۔ میں نے ریستوران چھوڑ کر بازار جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ سب سے منطقی انتخاب تھا: اچھا کھاؤ اور مقامی لوگوں کو بہتر طور پر دیکھو۔

قصباتی سپر مارکیٹوں میں سب کچھ سمجھ آ جاتا ہے: وہ کیسے کپڑے پہنتے ہیں، کتنا خرچ کرتے ہیں، اپنے بچوں کو کیسے دیکھتے ہیں، تھکن سے کیسے نمٹتے ہیں۔ یہ شہر کی سب سے سچی دکان کی کھڑکی ہے۔

میں نے اطالوی پروشوٹو کا ایک پیکٹ اور کچھ بفیلو موزاریلا اٹھایا — اُس یخ بستہ سردی میں ایک نایاب عیاشی — کہ سامان سے بھری ایک ٹرالی میرے پہلو سے آٹکرائی۔ بے اختیار میں نے سوچا کہ یہ اتفاق ہے۔ مگر میرے

تجربے میں عورتیں کوئی کام ”اتفاق سے“ نہیں کرتیں۔ انہیں ہمیشہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کدھر جا رہی ہیں۔

اس نے میری طرف دیکھا اور کہا، ”پروشوٹو اور موزاریلا... تم ضرور اطالوی ہو گے؟“ اس نے ایک سیکنڈ میں سب کچھ بھانپ لیا تھا: قومیت، ذوق، حتیٰ کہ خریداری کا سلیقہ بھی۔

اس کا نام روز تھا، چھپن برس کی۔

وہ اپنی بیٹی، داماد اور دو نواسوں کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ اس کی خوشی بھی تھے اور اس کا بوجھ بھی۔ اُس قسم کی عورت جو گھر کو سنبھالے رکھتی ہے اور کسی کو خبر نہیں ہوتی۔

میں نے قریب کے ایک کیفے میں کافی کی تجویز دی۔ اس نے بلا جھجک قبول کر لی۔ اس نے خریداری مکمل کی، سامان گاڑی میں رکھا، اور گاڑی چلا کر میرے پاس واپس آ گئی۔

میز پر بیٹھ کر وہ بولنے لگی۔ بہت زیادہ۔ میں سنتا رہا۔ میں نے ٹوکا نہیں۔ کبھی کبھی سب سے مضبوط لفظ وہ خاموشی ہوتی ہے جسے تم دوسرے کو استعمال کرنے دیتے ہو۔

ایک موقع پر وہ مسکرائی اور بولی: ”اطالوی، محبت، ماں، پیزا، اسپگیٹی...“ دقیانوسی تصورات پر بنا وہی پرانا جملہ، مگر اس میں سچی نرمی تھی۔ میں نے سوچا کہیں اس نے میری کوئی کتاب تو نہیں پڑھی۔

پھر اس نے بتایا: وہ ادیبہ تھی۔ اور اس نے میری ایک تحریر خریدی تھی، جو ایک قلمی نام سے چھپی تھی۔ خوش قسمتی سے: اس نے مجھے پہچانا نہیں تھا۔

وہ مجھے اپنی زندگی کے بارے میں بتاتی رہی، بھرا ہوا گھر، ایک جیسے دن، یہ ڈر کہ نواسوں کو کسی چیز کی کمی نہ رہ جائے، وہ محبت جو ظاہر نہیں کی جا سکتی کیونکہ وہ بدیہی لگتی ہے۔

جب وہ آخر کار رکی تو اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ یہ اُن نگاہوں میں سے ایک تھی جو ہزار لفظوں سے زیادہ کہتی ہیں۔

میں نے اس سے بس اتنا کہا: ”میں کل تمہاری کتاب خریدوں گا۔“ اور پھر تمہیں تبصرہ بھیجوں گا۔“

وہ جذباتی ہو گئی۔ اس کی آواز ہلکی سی کانپی: ”شکریہ۔ تمہیں نہیں معلوم کہ تم سے مل کر مجھے کیسا لگا۔ کیسا نفیس، شائستہ انسان... کیا سب اطالوی ایسے ہی ہوتے ہیں؟“

میں نے وہی جواب دیا جو ہمیشہ دیتا ہوں: ”ہاتھوں اور پیروں کو دیکھو۔ وہیں سے پتا چلتا ہے کہ کوئی شخص واقعی کہاں سے آیا ہے۔“

روز مسکرائی۔ یہ ایک ان دیکھی عورت کی مسکراہٹ تھی جو ایک سہ پہر کے لیے ان دیکھی نہیں رہی تھی۔

اختتامیہ - الاسکا

الاسکا نہ تمہارا استقبال کرتا ہے نہ تمہیں ٹھکراتا ہے۔ وہ تمہیں دیکھتا ہے۔ تمہیں ناپتا ہے۔ تمہیں تب تک معلق رکھتا ہے جب تک اسے معلوم نہ ہو جائے کہ تم ایک دن اور رکنے کے لائق ایماندار ہو یا چلے جانے کے لائق سمجھدار۔

اس ریاست میں فاصلہ جغرافیائی نہیں: انسانی ہے۔ لوگ ایسی خاموشیوں میں جیتے ہیں جو چند سیکنڈ کی ہوتی ہیں، مگر یہاں مہینوں کی بن جاتی ہیں۔ تنہائی ان کی مادری زبان ہے۔ اور عورتیں اسے سب سے اچھی طرح بولتی ہیں۔ میں نے چار مختلف کرداروں میں چار عورتیں دیکھیں، اور سب میں ایک بات مشترک تھی: وہ کسی کا انتظار نہیں کر رہی تھیں۔

ٹیکسی والی رکنے سے بچنے کے لیے گاڑی چلاتی تھی۔ پولیس والی ایک ایسی دنیا کو قابو میں رکھتی تھی جو قابو میں نہیں آ سکتی تھی۔ یونیورسٹی کی طالبہ ایک ایسی جگہ مستقبل ڈھونڈ رہی تھی جو حال چھین لیتی تھی۔ گھریلو خاتون پورا گھر سنبھالتی تھی اور کوئی اسے دیکھتا نہیں تھا۔

الاسکا میں عورتیں مانگتی نہیں۔ عمل کرتی ہیں۔

یہ وہ جگہ ہے جہاں زندگی مختصر ہے، رات طویل، اور سچ کو تماشاٹوں کی ضرورت نہیں۔

غور و فکر - الاسکا

الاسکا نے مجھے ایک سادہ اور سخت بات سکھائی: دنیا مردوں اور عورتوں میں تقسیم نہیں۔ یہ اُن میں تقسیم ہے جو بوجھ اٹھاتے ہیں اور اُن میں جو اسے دوسروں پر ڈال دیتے ہیں۔

اس ریاست میں بوجھ وہ اٹھاتی ہیں۔

میں نے نزاکت نہیں دیکھی۔ میں نے وقار دیکھا۔ میں نے ایک ایسا سکون دیکھا جو امن سے نہیں، طوفان کا عادی ہو جانے سے آتا ہے۔ میں نے ایسی عورتیں دیکھیں جو شکایت نہیں کرتیں کیونکہ جانتی ہیں کہ اگر کریں بھی تو کوئی نہیں سنے گا۔

الاسکا کی عورتیں اس لیے ان دیکھی نہیں کہ وہ موجود نہیں۔ وہ اس لیے ان دیکھی ہیں کہ کوئی انہیں اتنی دیر تک نہیں دیکھتا کہ واقعی دیکھ سکے۔

وہ وقت سے محروم مائیں ہیں، اوقات کے بغیر کام کرنے والیاں، تماشائیوں کے بغیر نگہبان۔ وہ معاشرے کا وہ حصہ ہیں جو تالیاں نہیں مانگتا۔ اور کبھی نہیں مانگے گا۔

الاسکا کی عورتیں اپنے تجربات کی بات نہیں کرتیں۔ اسی لیے اب میں کر رہا ہوں۔

ایریزونا

ایریزونا صحرا میں ایک کھلا زخم ہے۔ دھول، گھاٹیوں اور خاموشیوں کا ایک پھیلاؤ جو کفر نہیں بکتی، فیصلہ سناتی ہیں۔ یہاں سورج گرم نہیں۔ جلاتا ہے۔ اور رات ٹھنڈی نہیں۔ بانٹ دیتی ہے۔

یہ ایک سرحدی ریاست ہے، جہاں ہر سڑک پر کوئی مشکوک ہے۔ تارکین وطن، بارڈر پٹرول کے اہلکار، مقامی قبائل، سابق فوجی، ٹرک ڈرائیور، اکیلی عورتیں، ٹوٹے ہوئے خاندان: سب ایک بے رحم گرمی میں گھلے ملے۔

شہر جدید لگتے ہیں، مگر جیسے ہی تم حدود سے باہر نکلتے ہو، سچ محسوس ہوتا ہے: ایریزونا صحرا ہے، ویرانی ہے، منشیات ہیں، ثقافتوں کے ٹکراؤ ہیں،

مقامی جڑیں ہیں جو کبھی نہیں مرتیں، اور ایسی تنہائی ہے جس کا کوئی افق نہیں۔

اور عورتیں؟ یہاں وہ طوفان کی آنکھ میں جیتی ہیں: سرحد اور شناخت کے بیچ، بقا اور غرور کے بیچ، تشدد اور آزادی کے بیچ۔

ایریزونا کی عورت کچھ بھی ہو سکتی ہے: - مقامی ہوپی یا ناواہو- میکسیکن تارکِ وطن- کسی بھوت شہر کی اکیلی ماں- بارڈر پٹرول افسر- ریزرویشنز میں نرس- فینکس کی طالبہ جو فرار کے خواب دیکھتی ہے۔ مگر ہر کردار میں ایک ہی بوجھ ہے: رکے بغیر مزاحمت کرنا۔

سرحدی پولیس والی عورت، 38 برس

قانون نافذ کرنے والوں سے سامنا، دنیا میں کہیں بھی، ہمیشہ اُس معاشرے کا امتحان ہوتا ہے جس میں تم خود کو پاتے ہو۔ میں نے اسے ہمیشہ علاقے سے، اس کے اصولوں سے، اس کی حدوں سے، اس کے بھوتوں سے براہِ راست مقابلے کے طور پر جیا ہے۔

اُس سہ پہر میں نے آزاد اور خود مختار محسوس کرنے کے لیے ایک گاڑی کرائے پر لی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ سڑک میری ہے۔ مگر امریکہ میں سڑک کبھی تمہاری نہیں ہوتی۔ وہ تمہاری مقروض ہوتی ہے۔

میں چار گھنٹے بغیر رکے گاڑی چلاتا رہا۔ پھر پانچ۔ ایریزونا کا صحرا بے رحم ہے: نہ ختم ہونے والی گھاٹیاں، کپکپاتی خاموشیاں، میل جو سب ایک جیسے لگتے ہیں۔

اور پھر میں نے اسے دیکھا۔ بتیاں جلاتی بجھاتی ایک پولیس کار۔ رکنے کا حکم۔

ایک عورت باہر نکلی۔ اس کے نقوش واضح طور پر میکسیکن تھے، گہری سیاہ آنکھیں، پیچھے بندھے سیاہ بال، سرخ ہونٹ۔ گہرے رنگ کی Ray-Ban، اور ایک جسم جو جیسے خود صحرا سے تراشا گیا ہو۔ بغیر سوچے میں نے اس سے کہا:

”کیا یہ کسی مقابلہ حسن سے بھاگ کر آئی ہیں؟“

اس نے کسی کو خود کو چھونے نہ دیا۔ "مسخری مت کرو۔ کاغذات نکالو، ورنہ میں تمہیں گرفتار کر لوں گی۔"

بالکل ہوش مند۔ مہلک۔ پیشہ ور۔

میں نے سب کچھ اسے تھما دیا۔ معمول کے سوال: میں سرحد کے اتنا قریب کیوں تھا، کہاں سے آ رہا تھا، گھنٹوں سے سیدھی لکیر میں کیوں گاڑی چلا رہا تھا۔ "میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ کہمیاں چن رہا ہوں،" میں نے جواب دیا۔ "میں اصلی امریکہ دیکھنا چاہتا ہوں، وہ جو کتابوں میں نہیں ملتا۔" اس نے مجھے گاڑی سے باہر نکالا۔ ہر چیز کی تلاشی لی۔ پھر مجھے غور سے دیکھا۔ "تمہارے پاس شراب کیوں نہیں؟ تم سگریٹ کیوں نہیں پیتے؟" "میں سابق رگبی کھلاڑی ہوں۔ میری صرف ایک لت باقی ہے۔" "کھانا؟" اس نے کہا۔ "جو میں چاہتا ہوں وہ کھایا نہیں جا سکتا۔ اس سے صرف محبت کی جا سکتی ہے۔" "کتا؟" وہ ہنسی۔ "نہیں۔" وہ تن گئی۔ اسے احساس ہوا کہ میں حد سے بڑھ رہا ہوں۔ یہ خطرناک زمین تھی: اس کے پاس طاقت تھی، اختیار تھا، اور ایسا مزاج بھی جو اجازت نہیں مانگتا۔ "کیا تم جان سکتے ہو کہ کس سے صرف محبت کی جا سکتی ہے؟" اس نے پوچھا۔ "بالکل۔ وہ جس سے سب کچھ شروع ہوا، وہ جس نے ہمیں بنایا، وہ جو ہمیں زندہ رکھتی ہے، وہ جو ہمیں آگے لے جاتی ہے۔" "کون؟" "عورت۔ کیا وہ سمجھی نہیں؟" اس نے جواب نہیں دیا۔ اس نے کاغذات مجھے واپس تھما دیے۔ "واپس جاؤ۔ یہ تمہارا راستہ نہیں۔" میں نے بات مانی۔ یہی سب سے عقلمندی کی بات تھی۔ پھر رات آئی۔

اور رات دس بجے، اپنے ہوٹل کی لابی میں، میں نے اسے اندر آتے دیکھا۔ سادہ کپڑے۔ وہی نگاہ۔ وہی طاقت۔ ایک عورت جو ٹھیک ٹھیک جانتی تھی کہ اسے کیا چاہیے۔

وہ قریب آئی۔ "کیا میں ایک ڈرنک لے سکتی ہوں؟"

"نہیں،" میں نے جواب دیا۔ اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے میرا بازو پکڑا۔ "تم جا کیوں رہے ہو؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور سچ کہا:

"خطرے سے بھاگنا بزدلی نہیں۔ یہ عقل کی بات ہے۔"

اور میں چلا گیا۔

ناواہو عورت

اُس صبح میری آنکھ دیر سے کھلی۔ مجھے بعد میں کیمپس میں مہمان مقرر کے طور پر بولنا تھا۔ میں نے اپنا کام کا بیگ اٹھایا، پارکنگ تک گیا، اور پہلی بس میں سوار ہو گیا جس پر ”کیمپس“ لکھا تھا۔ ایک سادہ، احمقانہ، معصوم غلطی۔

ایک گھنٹے بعد بھی مجھے کچھ جانا پہچانا نظر نہیں آیا تھا۔ مختلف سڑکیں، مختلف مناظر، اور کوئی اثر نہیں رہا تھا۔ پھر بس رک گئی۔ آخری اسٹاپ۔

ناواہو ریزرویشن۔

اگلی بس اگلے دن جانی تھی۔ نہ فون، نہ رابطہ، نہ ساتھیوں کو بتانے کا کوئی طریقہ۔ مجھے اگلے دن پہنچ کر غلط فہمی کی وضاحت کرنی ہو گی۔ ایسا ہوتا ہے۔ زندگی خبردار نہیں کرتی۔

ریزرویشن میں داخل ہوتے ہی قبیلے کے سردار نے مجھے یوں گلے لگایا جیسے برسوں بعد لوٹنے والا کوئی رشتہ دار ہوں۔ اس نے مجھے اپنی بیوی، بیٹی اور قریبی رشتہ داروں سے ملوایا۔ انہوں نے مجھے گھمایا پھرایا، مشروب پیش کیا، اور سرسری انداز میں کہا:

”ہم آج سہ پہر تمہارے لیے دعوت کر رہے ہیں۔“

وہ کسی اور کا انتظار کر رہے تھے۔ میں اتفاقاً وہاں آ پہنچا تھا۔ یا کبھی کبھی تقدیر غلطی کا بھیس بدل کر آتی ہے۔ میں مسکرایا۔ میں نے قبول کیا۔ میں نے صحرا کو فیصلہ کرنے دیا۔

بھینسے کا گوشت۔ خون کے کیک۔ آلو، مرچیں اور پیاز۔ بیئر اور شراب بے حساب۔ ہر طرف روایتی لباس۔ آگ جل رہی تھی۔ دھیمے ڈھول۔ اور سردار کی بیٹی میرے سر پر سفید پر والی ٹوپی رکھ رہی تھی۔

وہ ایک سچی ناواہو تھی۔ خاموش۔ چوکس۔ سب کچھ دیکھنے اور کچھ نہ کہنے کی عادی۔ اُن عورتوں میں سے ایک جو روایت، محنت، اُن گھریلو

زخموں کے بیچ پلتی ہیں جن کی کوئی رپورٹ نہیں کرتا، اور ایک ایسی شناخت کے ساتھ جو کنکریٹ کے نیچے بھی نہیں مرتی۔

دعوت رات گئے تک چلتی رہی۔ وہ مناظر جو میں نے جان وین کی فلموں میں دیکھے تھے، مگر الٹے: وہ حملہ آور نہیں تھے۔ وہ بچ جانے والے تھے۔

انہوں نے مجھے سردار کے خیمے میں بھینسے کی کھالوں پر لٹا کر سلاپا۔ کوئی کپڑے نہیں۔ ایک قدیم رسم۔ میں نے قبول کیا۔ میں وہاں اُس دنیا کی مخالفت کرنے نہیں آیا تھا جس نے میرا استقبال کیا تھا۔ کچھ دیر بعد سردار کی بیٹی اندر آئی۔ وہی انداز۔ کوئی لفظ نہیں۔ بس موجودگی۔

پھر سردار اور اس کی بیوی آئے، ہر ایک اپنی اپنی کھال میں، ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو دیکھا۔ اور مجھے بھی۔ خوش۔ پُرسکون۔ جیسے سب کچھ اپنی صحیح جگہ پر ہو۔

اگلی صبح میں نے غسل خانہ ڈھونڈا۔ اس نے سرکنڈوں کے ایک جھنڈ اور ایک دریا کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے دریا میں نہانے کی کوشش کی، مگر پانی گدلا تھا اور مچھلیوں سے بھرا ہوا۔ میں سرکنڈوں میں چلا گیا۔ وہاں سب صاف لگ رہا تھا۔ میں غلط تھا۔

جیسے ہی میں جم کر بیٹھا، دو انڈین ہاتھوں میں اخبار لیے باہر نکلے، جیسے یہ دنیا کی سب سے عام بات ہو۔ پھر ایک تیسرا۔ پھر ایک اور۔

پورا گاؤں ایک ہی گنے کے کھیت میں ہگ رہا تھا۔

اور میں سمجھ رہا تھا کہ میں اکیلا ہوں۔

تہذیب کی طرف واپسی کی بس روانہ ہونے والی تھی۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

سردار کی بیٹی نے مجھے روکا۔ اس کی آنکھوں میں شک تھا۔ ”کیا میں تمہیں پھر دیکھوں گی؟“

میں نے اسے اپنا لیپ ٹاپ دے دیا۔ رابطے میں رہنے کا ایک ذریعہ۔ ایک موقع۔

مگر وہ رابطہ کبھی نہیں ہوا۔

کیونکہ انڈینز کی خاموشی غیر حاضری نہیں۔ یہ تاریخ ہے۔ یہ قانون ہے۔ یہ وہ یاد ہے جو کسی تصدیق کی طالب نہیں۔

بھوت شہر کی نرس - 45 برس

میرا تھائیرائیڈ گڑبڑ کرنے لگا تھا۔ میں کھا نہیں رہا تھا، مگر وزن بڑھ رہا تھا۔ وہی پرانی کہانی۔

میں نے فارمیسی آزمائی: نسخے کے بغیر دوا نہیں۔ سپر مارکیٹیں آزمائیں: نسخے کے بغیر ملنے والی کوئی قسم نہیں۔ واحد راستہ اسپتال بچا تھا۔ اور وہیں میری اس سے ملاقات ہوئی۔

کونچیتا۔

نرس۔ پینتالیس برس۔ وہ ایریزونا کے ویران علاقوں میں رہتی تھی، جہاں گرمی بددعا کی طرح بھاری ہے اور رات اوور ڈوز، دور کی سائرنوں اور خالی گھروں سے بھری ہوتی ہے۔ بھوت شہروں میں لوگ جیتے جی بھی غائب ہو جاتے ہیں۔

اس نے مجھے دیکھا۔ ہر روز وہ مایوس لوگ، نشے کے عادی، زخمی، ٹوٹے خاندان دیکھتی تھی۔ میرے جیسا کوئی — ایک غیر ملکی، سوٹ میں، شائستہ، اور یہاں صرف تھائیرائیڈ کی دوا کے لیے — فوری مسئلوں کی فہرست میں نہیں تھا۔

پھر بھی طریقہ کار ایک ناقابل عبور رکاوٹ تھا۔ Obamacare سب کے علاج کا انتظام کرتا تھا، ہاں، مگر صرف اس صورت میں کہ وہ اسپتال میں داخل ہوں۔

مجھے اسپتال میں داخل نہیں ہونا تھا۔ مجھے بس جیتے رہنا تھا۔

میں نے اصرار نہیں کیا۔ ضرورت نہیں تھی۔ میں نے بس اسے بتایا کہ میں قریب کے ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔ اپنا نام چھوڑ دیا: فرڈیننڈو۔ اور کچھ نہیں۔

میں چلا گیا۔ اُس رات، آدھی رات کے قریب، ہوٹل کا فون بجا۔ ریسپشنسٹ نے پوچھا کہ کیا میں ایک خاتون کو اوپر آنے کی اجازت دوں گا یا خود نیچے لابی میں آنا پسند کروں گا۔

میں نے نیچے جانا چنا۔

کونچیتا وہاں تھی۔ عام کپڑوں میں۔ بغیر وردی، بغیر کسی کردار کے۔

”کیا ہم بات کر سکتے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔ میں نے سر ہلایا۔

ہم قریب کے ایک پب میں گئے۔ آمنے سامنے بیٹھے، اس نے میز کے نیچے ہاتھ بڑھایا اور مجھے ایک چھوٹا سا سفید لفافہ تھما دیا۔ اندر میری دوائیں تھیں۔ اس نے انہیں یوں آگے بڑھایا جیسے کوئی نشئیوں کو منشیات تھماتا ہے۔ اسی احتیاط، اسی خطرے، اسی رازداری کے ساتھ۔

میں سمجھ نہ سکا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ میں نے اس سے کچھ نہیں مانگا تھا۔

یہ تب سمجھ آیا جب وہ بولی۔

”بات دوا کی نہیں،“ اس نے کہا۔ ”بات اس طریقے کی ہے جس سے اس نے چیزیں مانگیں۔ انداز۔ آداب۔ سلیقہ۔“

اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ ایک عورت جو اپنے دن چیخوں، ہنگامی حالات، تشدد اور غربت کے بیچ گزارتی ہے، فوراً پہچان لیتی ہے اُن کو جو لینا نہیں چاہتے، بس جینا چاہتے ہیں۔

”میں یہ ہر کسی کے لیے نہیں کرتی،“ اس نے مزید کہا۔ اور میں یہ جانتا تھا۔

غیر حاضریوں سے بھرے ایک صحرا کے بیچ، ایک ان دیکھی عورت نے وہاں موجود رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ٹوسان کی ملازمہ - 22 سالہ تارکِ وطن

سہ پہر میں مجھے کچھ میٹھا کھانے کی طلب ہوئی۔ یہ بھوک نہیں تھی، پیار کی کمی تھی، اور میں یہ جانتا تھا۔ سب سے آسان علاج یہ تھا کہ کسی ریستوران میں بیٹھ کر کچھ میٹھا منگوا لوں۔

ویٹریس فوراً آ گئی۔ چھوٹی، دہلی، جسم سے نازک مگر حرکت میں تیز۔ وہ اسکرٹ پہنے Speedy Gonzales کی بہن لگتی تھی: میزوں کے بیچ یوں پھسلتی تھی جیسے اس کے ٹخنوں میں آگ لگی ہو۔

”تمہاری عمر کیا ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے نوٹ پیڈ کی طرف دیکھا تک نہیں۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔
”تمہیں اس سے کیا؟ کھاؤ، پیسے دو، اور جاؤ۔ اور اگر مجھے تنگ کیا تو میں پولیس بلا لوں گی۔“

بائیس کلو کا جسم۔ بیس ٹن کا مزاج۔ کانچ کے مرتبان میں خالص ڈائنمائٹ۔ مالک فوراً معذرت کرتا ہوا باہر آیا۔ اس نے سب کچھ دیکھا تھا۔ میں نے کچھ غلط نہیں کیا تھا، مگر وہ تجزیہ کرنے والی نہیں تھی: وہ ردِ عمل دیتی تھی۔

اس نے مجھے اپنی کہانی سنائی۔ وہ میکسیکو سے خالی ہاتھ آئی تھی: نہ پیسہ، نہ خاندان، نہ پکے کاغذات، نہ کوئی یقین۔ وہ زندہ رہنے کے لیے میزوں پر کھانا پہنچاتی تھی اور ایسے مستقبل کی امید رکھتی تھی جو ایریزونا شاذ ہی دیتا ہے۔

اسے جلدی تھی۔ دنیا بھر کی جلدی۔ اور وہی جلدی اس کی حد تھی۔ میں نے قلم اور کاغذ مانگا۔ ایک خط لکھا۔ نہ رومانیت، نہ خوش فہمیاں: بس سچ۔ میں نے وہ مالک کے ذریعے اس کے لیے چھوڑ دیا، جس نے یوں سر ہلایا جیسے کوئی احترام دکھانے والے کو سر ہلاتا ہے۔

اگلے دن میں اس جگہ کے پاس سے گزرا۔ اندر نہیں گیا۔ بس دیکھنا چاہتا تھا۔ اچانک مجھے پیچھے سے تیز قدموں کی آواز سنائی دی۔ میری پیٹھ پر ایک ضرب۔

میں مڑا۔

وہ تھی۔

کھنچا ہوا چہرہ، بے چین آنکھیں، اکھڑی ہوئی سانس۔

”میں بائیس سال کی ہوں،“ اس نے کہا۔

”اور تم آخر کس جہنم میں سوتے ہو؟ میں ساری رات تمہیں ڈھونڈتی رہی۔ پولیس کو بھی نہیں معلوم کہ تم کہاں ہو۔“

میں نے اسے دیکھا۔ وہ وہی لڑکی تھی جو پچھلی رات تھی، مگر زرہ کے بغیر۔ ایک بچی، ایک ایسی دنیا میں جو بڑوں کو نگل جاتی ہے۔

میں نے اسے خدا حافظ کہا۔ اور چلا گیا۔ بے پروائی سے نہیں۔ احترام سے۔ کیونکہ کچھ نزاکتوں کو چھونا نہیں چاہیے: انہیں جانے دینا چاہیے۔

اختتامیہ - ایریزونا

ایریزونا ایک منظر نہیں: یہ ایک سرحد ہے۔ اور سرحدیں پار نہیں کی جاتیں۔ ان کا سامنا کیا جاتا ہے۔

اس ریاست میں گرمی درجہ حرارت نہیں: یہ فیصلہ ہے۔ صحرا جگہ نہیں: یہ تنہائی ہے۔ لوگ جیتے نہیں، مزاحمت کرتے ہیں۔

میں چار عورتوں سے ملا اور سب کے پاس ایک ہی لفظ تھا: بقا۔ سرحدی پٹرول والی، دانتوں تک مسلح مگر اتنی ہی اکیلی جتنا وہ صحرا جس کی وہ نگرانی کرتی ہے۔ ناواہو عورت، ایک بے رحم زمین اور کبھی نہ بھرنے والی یاد کی بیٹی۔ بھوت شہروں کی نرس، جو بن دیکھے زندگیوں کا علاج کرتی ہے اور انہیں بچاتی ہے جن کے پاس کچھ نہیں بچا۔ تارک وطن ویٹریس، غصے اور نزاکت کے بائیس برس، اپنے سے بڑی ایک دنیا سے جنگ میں۔

چار مختلف راستے۔ اندر ایک ہی صحرا۔

ایریزونا میں عورتیں مستقبل کا انتظار نہیں کرتیں: وہ پوری قوت سے اسے ڈھونڈتی ہیں۔ اور جب نہیں ملتا تو چلتی رہتی ہیں۔ کیونکہ رکنے کا مطلب غائب ہو جانا ہے۔

مرد اس ریاست کو گھاٹیاں دیکھنے کے لیے پار کرتے ہیں۔ عورتیں موت سے بچنے کے لیے۔ اور وہ یہ خاموشی سے کرتی ہیں، کسی سے کچھ مانگے بغیر۔

غور و فکر - ایریزونا

صحرا تمہیں ایک بات سکھاتا ہے: کوئی اکیلا زندہ نہیں رہتا۔

پھر بھی ایریزونا کی عورتیں یہی کرتی ہیں۔ ہر دن۔ ہر رات۔ ایک دم بخود کر دینے والی آب و ہوا میں اور ایک ایسے معاشرے میں جو تقاضا کرتا ہے کہ تم مضبوط رہو، تب بھی جب تم نہ رہ سکو۔

یہ وہ عورتیں ہیں جن کے پاس شکایت کا وقت نہیں۔ خواب دیکھنے کا وقت نہیں۔ غلطی کرنے کا وقت نہیں۔

اور میں نے، ایک بار پھر، وہی کیا جو ہمیشہ کرتا ہوں: ان سے ملا، انہیں دیکھا، سنا، اور پھر جانے دیا۔ کیونکہ احترام روک کر نہ رکھنے سے بھی آتا ہے۔ ایریزونا نے مجھے یاد دلایا کہ کچھ زندگیاں سمجھے جانے کی درخواست نہیں کرتیں: وہ بس یہ چاہتی ہیں کہ انہیں نظرانداز نہ کیا جائے۔ اور میں انہیں نظرانداز نہیں کروں گا۔ کبھی نہیں۔

آرکنساس

آرکنساس پہاڑیوں، دریاؤں اور چرچراتے لکڑی کے گھروں کے بیچ ایک دھیمہ موڑ ہے۔ یہ ایک ایسی ریاست ہے جو شور نہیں مچاتی کیونکہ شور ناپسندیدہ توجہ کھینچتا ہے۔ یہاں سب کچھ ہڈیوں تک چھلا ہوا ہے: کھیتی باڑی کی مزدوری، بھلائی ہوئی کانیں، الگ تھلگ برادریاں، ایسے محلے جہاں غربت کوئی مرحلہ نہیں بلکہ ورثہ ہے۔

یہ وہ امریکہ ہے جو نقشے سے باہر جیتا ہے۔ دولت مغرب میں ہے۔ جدیدیت شمال میں۔ باقی یہاں رہ جاتے ہیں: وہ جن کے پاس کوئی متبادل نہیں تھا۔

آرکنساس کی عورتیں وہ ہیں جو باقی بچی چیزوں کو جوڑے رکھتی ہیں: غیر مستحکم خاندان، گرتے ہوئے گھر، غیر حاضر یا کام کے بوجھ تلے دیے شوہر۔ آرکنساس کی عورت جلد بڑی ہوتی ہے، جلد شادی کرتی ہے، اور جلد بوڑھی ہو جاتی ہے۔

وہ ہے: - کل وقتی ماں - بغیر سند کی نرس - کام چلاؤ ماہر نفسیات - باورچن، ڈرائیور، معلمہ - سپر مارکیٹوں میں، کھیتوں میں، سستے کلینکوں

میں کم اجرت پر کام کرنے والی مزدور۔

مگر بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ آرکنساس کا ایک اور رخ بھی ہے: سخت، چھپا ہوا، ایسی نوکریوں سے بنا جو اختیار تو دیتی ہیں مگر زندگیاں چھین لیتی ہیں۔ وہ یہ بھی ہے: - ایک ڈاک ملازمہ جو پورے ملک کے راز جانتی ہے - مقامی کمپنیوں کی منیجر، بغیر بونس یا شہرت کے، صرف ذہنی دباؤ کے ساتھ - ٹیکس اور محصولات کی افسر، جس سے ڈرا جاتا ہے مگر جسے نظر انداز کیا جاتا ہے، کاغذی کارروائی اور کم تنخواہ تلے کچلی ہوئی - FBI کی ایجنٹ جس کا سزا کے طور پر یا تحفظ کے لیے یہاں تبادلہ کیا گیا، خاموشی پر مجبور - وائر ورکس کی تکنیکی ماہر، جو ایک ایسی برادری کو پانی یقینی بناتی ہے جو اس کا نام تک نہیں جانتی - ایک دوا ساز کمپنی کی کارکن، جہاں علاج کا وعدہ کیا جاتا ہے مگر تھکا دینے والی شفٹیں دی جاتی ہیں

ایمان ایک لنگر ہے۔ مشقت روز کی بات ہے۔ تنہائی معمول ہے۔

یہاں عورتیں آزادی نہیں ڈھونڈ رہیں: وہ مہلت ڈھونڈ رہی ہیں۔ اور اکثر انہیں نہیں ملتی۔

ڈاک ملازمہ - 48 برس

آرکنساس میں ڈاک خانہ قصبے کے دل میں ہوتا ہے۔ یہ صرف ایک ایسی جگہ نہیں جہاں سے خطوط اور پارسل گزرتے ہیں - وہاں افواہیں، چیک، شکایتیں، فراڈ اور اعترافات گردش کرتے ہیں۔

وہ اسے چلائے رکھتی ہے۔ وہ سب کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے۔ مگر اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔

میرے لیے یہ اپنی ماں کے دفتر میں لوٹنے جیسا تھا۔ ڈاک خانے میں پینتیس برس، اور کچھ طور طریقے فوراً پہچانے جاتے ہیں: سخت درجہ بندیاں، چند منتخب لوگوں پر بھروسہ، پیسہ ہاتھ بدلتا ہوا مگر ہمیشہ نگرانی میں۔ یہ جانتے ہوئے اندر گیا کہ مجھے کس قسم کا جواب ملے گا۔ پیش بینی ایک فائدہ ہے۔

یہ ایک لطیفہ ہی تھا کہ 48 سالہ ڈائریکٹر کرس نے اپنے دفتر کا دروازہ کھولا۔ اس نے فوراً میرے ساتھ ایک "غیر ملکی مشیر" جیسا برتاؤ کیا، اُس

تجسس اور بے اعتمادی کے ملے جلے انداز سے جو اُن عورتوں میں ہوتا ہے جو کسی پر بھروسا نہ کرنے کی عادی ہوں مگر سب کچھ اکیلے کرتے کرتے تھک چکی ہوں۔

پہلے اس نے مجھے دکھایا کہ وہ کیا کر سکتی ہے۔ پھر، زیادہ ہمت سے، کہ وہ کیا چاہتی ہے۔

پہلی رکاوٹ دور ہوئی تو پیسوں اور اس کے روزمرہ کے آلات سے رابطے نے باقی سب پگھلا دیا۔ وہ بولنے لگی۔ انتظامیہ سے مشکل تعلقات، کیریئر کی رکاوٹیں، ٹوٹے وعدے، مسلسل جانچ پڑتال، صفر قدر دانی۔

”مجھے فوری اور مؤثر حل چاہئیں،“ اس نے کہا۔

میں نے بس اسے ایک لاطینی جملہ کہا، اشتعال کے طور پر یونہی پھینکا ہوا: ”Do ut des“۔ میں تمہیں دیتا ہوں تاکہ تم دو۔

وہ فوراً سمجھ گئی: ”اگر تم میری مدد کرو تو میں تمہیں وہ سب دوں گی جو تم چاہو۔“

تین دنوں میں میں نے جنرل مینجمنٹ کے لیے خطوط کا ایک سلسلہ تیار کیا۔ اس نے انہیں پڑھا، ان پر جوابی دستخط کیے، اور بھیج دیا۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد طلبی آ گئی۔

اس نے اصرار کیا کہ میں مشیر کے طور پر اس کے ساتھ چلوں۔ میں مان گیا۔ نتیجہ واضح تھا: - افسر سے منیجر کی طرف منتقلی - تنخواہ میں اضافہ - وہی عہدہ - بہت کم جانچ پڑتال۔

وہ خوشی سے اچھلتی ہوئی دفتر سے نکلی۔ یہ ایک مسئلہ تھا جسے وہ کم از کم پانچ برس سے اٹھائے پھر رہی تھی، اور ایک ہفتے میں وہ غائب ہو گیا۔ شام کو وہ مجھے کھانے پر لے گئی۔

وہ نفیس لباس میں آئی، دفتر والی اُس عورت سے مختلف جسے میں نے دیکھا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ کسی نے اسے تیار ہونے میں مدد دی تھی: ساتھیوں نے، سہیلیوں نے، اس کی بیٹی نے۔ سب اُس تبدیلی میں شریک ہوئے تھے، ”نظرانداز“ سے ”نمایاں طور پر عورت“ تک۔

کھانے کے آخر میں وہ بل ادا کرنے کاؤنٹر پر گئی۔ بغیر ادا کیے واپس آ گئی۔ مالک نے اسے روک دیا تھا: بل پہلے ہی ادا ہو چکا تھا۔

میں نے پہلے ہی اسے خبردار کر دیا تھا: ”اس سے ایک پیسہ بھی مت لینا۔ یہ میرا حساب ہے۔“

کرس مسکرائی۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ چلو۔ ”میں تمہیں گھر لے چلتی ہوں۔ میں تمہیں وہ تحفہ دینا چاہتی ہوں جس کے تم حق دار ہو۔“

میں ٹھیک ٹھیک جانتا تھا کہ اس کے ذہن میں کیا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ آگے چلے، میں تھوڑی دیر میں آ ملوں گا۔

اور میں، دوسری طرف، ہوائی اڈے کی طرف چل پڑا۔ میں نے ریاست چھوڑ دی۔

تین دن بعد مجھے اس کی ای میل ملی۔ اس نے لکھا کہ وہ میرے رویے سے مایوس ہے، مگر شکرگزار بھی۔ اسے، اس کے اپنے الفاظ میں، ”ایک خاص آدمی ملا تھا جو میری زندگی بدلنے کے بدلے کچھ نہیں چاہتا تھا۔“

راہ سے بھٹکی FBI ایجنٹ - 38 برس

وہ واشنگٹن سے آئی ہے، بڑی تفتیشیوں، بھاری بریفنگز اور شیشے سے گھرے کمروں کی عادی، جہاں مرد دوسروں کی زندگیوں کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اب وہ آرکنساس کے ایک مضافاتی دفتر میں ہے: سستی منشیات، گھریلو تشدد، ضدی خاموشیاں۔ اس کی طاقت بے کار ہے۔ اس کی تنہائی نہیں۔

میں وہاں سفارت خانے کے سامنے اپنی صلاحیتیں اور اپنی کمزوریاں درج کرانے گیا تھا۔ معمول کی کارروائی۔ میں اس کے دفتر میں داخل ہوتا ہوں: ماریون، 38 برس، ایک وفاقی ایجنٹ جسے زبردستی یہاں بھیجا گیا۔

”ہمیں ایک دوسرے کو نام سے پکارنا ہوگا، نینڈو،“ اس نے فوراً کہا۔ ”بتاؤ: کیا تمہاری کوئی کمزوری ہے؟“

”ہاں۔ عورتیں۔“

وہ اکڑ گئی۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”میں ان کی مدد کرتا ہوں، اگر ہو سکے تو ان سے محبت کرتا ہوں... اور انہیں چھوڑ دیتا ہوں۔“

”کیوں؟“ اس نے پوچھا۔ ”کیونکہ تم ہمیشہ انہی دانتوں سے چباتے ہو، جبکہ ہمارے پاس اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ یہ روئے کی بات ہے: ہر چیز تھامی نہیں جا سکتی، ہر چیز روکی نہیں جا سکتی۔“ اب وہ چاہتی تھی کہ اس کا تجزیہ کیا جائے۔ ”تو میرے ساتھ بھی یہی کرو۔ بتاؤ مجھے یہاں کیوں بھیجا گیا۔ دکھاؤ تمہیں کیا نظر آتا ہے۔“

تین منٹ۔ اس سے زیادہ نہیں۔ اس کے بکھر جانے کے لیے اتنا کافی تھا۔

اس کا مسئلہ سیدھا سا تھا: وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتی تھی۔ FBI جیسے ادارے میں یہ ایک لعنت ہے۔ یہ تمہیں کمزور بناتی ہے، ناقابل اعتبار بناتی ہے، وہ تم سے تمہاری تفتیشیں چھین لیتے ہیں اور تمہیں وہاں بھیج دیتے ہیں جہاں تم کوئی نقصان نہ کر سکو۔

میں نے اسے بتا دیا۔ بغیر کسی پردے کے۔

پہلے اس نے انکار کیا۔ پھر ایک لمحہ سوچا۔ اور رو پڑی۔ اس نے مجھے ایسے گلے لگایا جیسے اس شخص کو لگایا جاتا ہے جو سچ بول رہا ہو جب کسی اور میں ایسا کرنے کی ہمت نہ ہوئی ہو۔

پھر اس نے میری حیثیت کی تصدیق کرنے والے کاغذات پر دستخط کر دیے۔ یہ ایک منطقی عمل تھا، مگر اس کے دستخط جذباتی تھے۔

باہر نکلتے ہوئے میں نے واشنگٹن فون کیا۔ تبادلے کی درخواست کی: ”مجھے میامی بھیج دو۔ میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ وہاں میں آزاد رہوں گا۔“

چھ مہینے بعد بھی ماریون مجھ سے رابطے میں تھی۔ فون، ای میلز، ملاقات کی درخواستیں۔

میں اسے ہمیشہ ایک ہی بات کہتا: ”کوئی مستقبل نہیں ہے۔ میں پہلے ہی کہیں اور ہوں۔“

اس نے ہار نہیں مانی۔ وہ FBI میں تھی۔ اور جب FBI تمہیں نشانے پر لے لے تو وہ فوراً پیچھا نہیں چھوڑتی۔

دوا ساز کارخانے کی ملازمہ - 55 برس

وہ ایک ایسے کارخانے میں کام کرتی ہے جو پوری قوم کے لیے دوائیں بناتا ہے۔ ایک زبردست ستم ظریفی: وہ دوسروں کا علاج کرتی ہے، خود کو زہر دیتی ہے۔ بھاری کیمیکل، سخت شفٹیں، ایسے ماسک جو صرف آدھی حفاظت دیتے ہیں، ایسی تنخواہ جو کسی چیز سے حفاظت نہیں کرتی۔ کوئی اس کا نام نہیں جانتا۔ ہر کوئی وہ گولیاں کھاتا ہے جو اس کے ہاتھوں سے گزرتی ہیں۔

میرا وہاں جانا طے شدہ نہیں تھا۔ سب کچھ کووڈ کے بعد ایک عشائیے پر شروع ہوا، جب میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ میں نے Pfizer کی چار خوراکیں لی ہیں، سب ایک ہی بیچ کی، اور اس بیچ میں ایک "Viagra" قسم "تھی جو مستقل فوائد کی ضمانت دیتی تھی۔ ایک مذاق۔ میرے مذاقوں میں سے ایک۔

مگر قریب کی میزوں پر کسی نے سن لیا۔ اور یہ خبر پورے ملک میں پھیل گئی۔ پھر پوری دنیا میں۔

دوا ساز کمپنی مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ سمجھنے کے لیے۔ تصدیق کے لیے۔ کیونکہ امریکہ میں اچھا سماجی شور کسی شیئر کی قیمت دگنی کر سکتا ہے۔

وہ مجھے کارخانے کے اندر لے گئے۔ جیسے ہی میں داخل ہوا، 130 لوگ کھڑے ہو گئے اور تالیاں بجانے لگے۔ میرا چہرہ سرخ تھا، اور انہیں یقین تھا کہ میں "راز" کھولنے والا ہوں۔

میں نے سچ بتایا: "یہ ایک مذاق تھا۔" انہوں نے یقین نہیں کیا۔

منیجرز، افسروں اور سیکرٹریوں نے مجھے گھیر لیا: ہر ایک کو کوئی تفصیل چاہیے تھی، کوئی تصدیق، تکنیکی سچ کا کوئی اشارہ۔

مگر ایک مزدور عورت نے، 55 برس کی، کیمیکلوں سے برباد ہاتھ، برسوں کی آن دیکھی محنت سے جھکی کمر، مجھ سے ملاقات مانگی۔ وہ اسے میرے ساتھ ایک کمرے میں لے گئے۔ وہ اداس اندر آئی۔ خالی۔ تھکی ہوئی۔

ہم نے پینتالیس منٹ بات کی۔

ویکسینوں کی نہیں۔ بیچوں کی نہیں۔ معجزاتی طاقتوں کی نہیں۔

ہم نے زندگی کی بات کی۔ ان ناکامیوں کی جنہیں معمول کہہ کر چلا دیا جاتا ہے۔ ان خوابوں کی جو دفن کر دیے گئے کیونکہ وہاں کسی کو انہیں دیکھنے کی عیاشی میسر نہیں۔

میں نے اسے صرف ایک سچ بتایا: ”خواب دیکھنا علاج نہیں کرتا، مگر بچا لیتا ہے۔ اور یہ اس سب سے سستی دوا سے بھی کم قیمت ہے جو تم بناتی ہو۔“ وہ مسکراتی ہوئی نکلی۔ اس کی ساتھیوں نے اسے ایسے دیکھا جیسے اسے ہر زہر کا تریاق مل گیا ہو۔

”اس نے تمہیں کیا کہا؟“ انہوں نے اس سے پوچھا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ اور میں کبھی نہیں بتاؤں گا۔

یہ دنیا کا سب سے سادہ راز تھا: لفظ، اگر تم انہیں صحیح جگہ رکھنا جانتے ہو، وہاں جگہ کھول دیتے ہیں جہاں ہوا نہیں تھی۔

اور اس کے لیے، اُس دن، بس سانس لینا کافی تھا۔

نفیس چور عورت - 30 برس

وہ فطرتاً چوری نہیں کرتی۔ وہ اس لیے چوری کرتی ہے کہ آرکنساس ان لوگوں کو معاف نہیں کرتا جو خالی ہاتھ پیدا ہوتے ہیں۔

وہ پڑھی لکھی ہے، ذہین ہے، اور ڈرا دینے کی حد تک شاندار۔ وہ منیجر بن سکتی تھی، پروفیسر، مشیر۔ اس کے بجائے وہ ایک سایہ بن گئی ہے: گھروں، چیٹس، شناختوں، وعدوں اور کھوئے ہوئے موقعوں کے بیچ گھومتی ہے۔

میں اس سے آن لائن ملا۔ Skype پر مدد کی ایک درخواست آئی، صاف ستھرا پروفائل، ایک نام جو کوڈ لگتا تھا: Last A۔ اسے خوبصورت کہنا توہین تھی۔ خوبصورت کم تر لفظ تھا۔ چور ہونا فطری تھا۔ بے وقوف ہونا معمول تھا۔ مکمل میک اپ والی ایک پھیلی۔

اس نے مجھ سے مدد مانگی۔ میں نے دی۔

ایک سال کے اندر اس نے 14 ہزار ڈالر جمع کر لیے، سب کے سب اپنی بتائی ہوئی ضرورتوں کے لیے۔ کبھی کوئی ملاقات نہیں۔ کبھی کوئی ویڈیو کال نہیں۔ کبھی کوئی فون نہیں۔ صرف ڈیجیٹل خط، احتیاط سے گھڑی ہوئی درخواستیں، ایسی ہنگامی حالتیں جو سچی لگتی تھیں۔

یہ سب سے میٹھا فراڈ تھا جو میرے ساتھ کبھی ہوا۔

آخر کار میں نے اسے ڈھونڈنے جانے کا فیصلہ کیا۔ لٹل راک۔ بل اور ہیلری کلنٹن کا شہر۔

میں اس کی ماں ریٹا سے ملا۔ ایک مہربان، الجھی ہوئی عورت جو اپنی بیٹی کو صحیح معنوں میں جانتی ہی نہیں تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ ذرا نہ چونکی؛ بلکہ اس نے مجھ سے اور پیسے مانگے، اسی سہولت سے جیسے کوئی سانس لیتا ہے۔

اسی لمحے میں نے سچ دیکھا۔

وہ اکیلی نہیں تھی۔ وہ گھانا کے ایک گروہ سے جڑی تھی۔ اپنی کمائی کا 55% انہیں لوٹا دیتی تھی۔ مجبوری کی ایک پیشہ ور۔ سب نے مجھ سے پوچھا کہ میں ایسے گندے کھیل میں کیسے پھنس گیا۔ میں نے کیسے یقین کر لیا۔ پیسے دیے۔ ڈٹا رہا۔ قبول کیا۔

مگر جواب سیدھا تھا، اور میرے اندر صاف تھا:

جو مدد کے لیے بنے ہوتے ہیں وہ برائی کا نہیں سوچتے۔ انہیں صرف وہ بھلائی نظر آتی ہے جو وہ کر سکتے ہیں، تب بھی جب دنیا انہیں کچھ اور دکھا رہی ہو۔

اختتامیہ - آرکنساس

آرکنساس ایک ریاست نہیں: یہ ایک سست پھندا ہے۔ غربت، خاموشی، معمولی کام اور خاموشی سے ممتی زندگیوں کا جال۔ جن عورتوں سے میں یہاں ملا وہ نجات نہیں مانگ رہی تھیں۔ وہ بس سانس لینے کی ایک جگہ مانگ رہی تھیں۔

ڈاک خانے کی ملازمہ، ملک کے سارے رازوں کی ملکہ، صرف اپنی قدر واپس چاہتی تھی۔ FBI ایجنٹ، جو اوپر سے گری، جرم سے زیادہ اپنے آپ سے لڑی۔

دوا ساز کارخانے کی ملازمہ، گولیوں اور کیمیکلوں کے بیچ آن دیکھی، تھوڑا تھوڑا خود کو زہر دے کر دنیا کو بچاتی رہی۔ اور نفیس چور... وہ اس ریاست کی مکمل علامت تھی: ذہین، شاندار، مگر اس راستے کو چننے پر مجبور جو زندگی نے اس پر مسلط کیا تھا۔

آرکنساس نے مجھے ایک سادہ سی بات دکھائی: یہاں عورتیں جیسے تیسے زندہ رہتی ہیں۔ کچھ ڈٹی رہتی ہیں۔ کچھ بھاگ گئیں۔ کچھ سائے میں سرک جاتی ہیں کیونکہ روشنی وہاں کبھی تھی ہی نہیں۔

اور وہ سب، کسی نہ کسی طرح، غیر حاضر رہتی ہیں۔ اس لیے نہیں کہ وہ موجود نہیں۔ بلکہ اس لیے کہ انہیں کوئی نہیں دیکھتا۔

غور و فکر - آرکنساس

اس ریاست میں میں نے سمجھا کہ غربت ایک معاشی حالت نہیں۔ یہ جذباتی، ثقافتی اور ذہنی حالت ہے۔ یہ اس گہرے یقین کا نام ہے کہ انسان کسی اور چیز کا حق دار نہیں۔ جو یہاں پیدا ہوتے ہیں انہیں ایک آن لکھی تقدیر سے لڑنا پڑتا ہے۔

آرکنساس کی عورت کا کوئی مستقبل نہیں: وہ اسے اپنے خالی ہاتھوں سے بناتی ہے۔ ہر روز۔ ایک ایسے معاشرے کے اندر جو موقعوں کی بات کرتا ہے مگر صرف بقا بانٹتا ہے۔

مجھے یہاں ایک بات صاف نظر آئی:

عورتیں گرتی نہیں۔

انہیں گرنے دیا جاتا ہے۔

اور اصل گناہ غربت نہیں۔ یہ ان کی بے حسی ہے جو دیکھتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔

میں گزر نہیں جاتا۔ میں دیکھتا ہوں، سنتا ہوں، لکھتا ہوں۔ اور میں یہ کہانیاں اس مٹی سے باہر لاتا ہوں کیونکہ اگر میں ایسا نہ کرتا تو وہ یہاں کی ہر چیز کی طرح دفن رہتیں: خاموشی، گرد اور شرم میں۔

کیلیفورنیا

کیلیفورنیا ایک ریاست نہیں: یہ ایک اجتماعی فریب ہے۔

جو اسے دور سے دیکھتے ہیں ان کے لیے اس کا سورج، کھجور کے درخت، سنیمہ، ٹیکنالوجی، سمندر، امریکی خواب۔ جو اسے نیچے سے جیتے ہیں ان کے لیے یہ ایک مسلسل دراڑ ہے: انتہائی دولت مطلق غربت سے چند میٹر کے فاصلے پر، ہائی ٹیک کام کھیتوں میں فصل کٹائی کے ساتھ ساتھ، بند ولاز، اور فٹ پاتھ پر پلاسٹک کے خیمے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں دنیا امکانات ڈھونڈنے آتی ہے اور پہلے سے لکھی ہوئی درجہ بندیاں پاتی ہے۔

عورتوں کے لیے کیلیفورنیا ایک جھوٹا وعدہ ہے: - ظاہری آزادی - اعلان کردہ حقوق - نمائشی مواقع۔

مگر اصول ہمیشہ ایک ہے: اگر تم رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتیں تو غائب ہو جاتی ہو۔

یہاں کی غیر موجودگیاں خاموشیاں نہیں: یہ وہ جسم ہیں جنہیں نظام پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر چھوڑ دیتا ہے۔

سلیکون ویلی کی عورت - 39 برس

اسے "جدت کا دارالحکومت" کہتے ہیں، مگر سلیکون ویلی ایک بند جاگیر ہے جہاں طاقت مردانہ ہے، سفید فام یا ایشیائی، انجینئرنگ پر مبنی، جنون کی حد تک مسابقتی۔

یہاں عورتوں کا سرکاری طور پر خیر مقدم ہے: - تنوع کے پروگرام - کارپوریٹ ضابطہ اخلاق - صنفی برابری کے پینل - سالانہ رپورٹوں میں مسکراتی تصویریں۔

مگر ان کمروں کے اندر جو اہم ہیں، منظر مختلف ہے۔

اس کے پاس دو ڈگریاں ہیں، ایک ماسٹرز، بہترین انگریزی، اعلیٰ تکنیکی مہارتیں۔ وہ ڈیجیٹل مصنوعات، ڈیٹا اور پلیٹ فارمز پر کام کرتی ہے۔ اس کے دن ایسی میٹنگوں میں گزرتے ہیں جہاں اصل خیالات کا فیصلہ تین لوگ کرتے ہیں: دو میز پر، ایک اسکرین پر۔

اس سے نرم مہارتوں، ثالثی کی صلاحیت اور ہمدردی کا تقاضا کیا جاتا ہے۔ اسے رابطہ کاری کا کردار دیا جاتا ہے، حکم دینے کا نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ موجود ہو، مگر مرکزی کردار نہ ہو۔

اس نظام میں ماں بننا ایک انتظامی بے قاعدگی ہے۔ مراعات ہیں، چھٹیاں ہیں، مدد ہے، بیضے منجمد کرنے کی سہولتیں ہیں، کمپنی کا ڈے کیئر ہے — مگر ہمیشہ ایک آن کہی شرط کے ساتھ: تمہیں رفتار کم نہیں کرنی۔

اگر وہ حاملہ ہو جائے تو اسے ایک ممکنہ مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ اگر نہ ہو تو اسے "اسکرٹ میں مرد" سمجھا جاتا ہے، باقی سب کی طرح قابل تبدیل۔ دونوں صورتوں میں وہ ایک آلہ ہے: کبھی توجہ کا مرکز نہیں۔

شام کی میٹنگیں، "ہنگامی" ویک اینڈ، اور ایشیا یا یورپ کے ساتھ رات گئے کی کالیں تمہاری نجی زندگی پر اثر نہیں ڈالتیں۔ نظام مکمل دستیابی کا تقاضا کرتا ہے۔

جب وہ ٹوٹ جاتی ہے — برن آؤٹ، بے چینی، بے خوابی، معنی کا بحران — تو جواب ہمیشہ ایک ہوتا ہے: — یوگا — مائٹڈفلنس — نجی تھراپی۔

کبھی ڈھانچے کی بنیادی تبدیلی نہیں۔ کبھی طاقت کی حقیقی دوبارہ تقسیم نہیں۔

اس کی غیر موجودگی جسمانی نہیں: علامتی ہے۔ وہ ہر عمل میں موجود ہے، مگر آخری اعتراف میں کبھی نہیں۔

ٹیکنالوجی دنیا کو عورتوں کی خود مختاری کی کہانیاں بیچتی ہے۔ مگر گہرائی میں عورتیں ایسے استثنا رہتی ہیں جنہیں سنبھالنا ہے، ایسے ستون نہیں جنہیں تسلیم کرنا ہے۔

سینٹرل ویلی کی مہاجر - 28 برس

سینٹرل ویلی کیلیفورنیا کا وہ حصہ ہے جسے سیاح نہیں دیکھتے اور فلمیں نہیں دکھاتیں۔

یہ وہ زرعی راہداری ہے جو آدھے ملک کو کھلاتی ہے: — پھلوں کے کھیت — سبزیاں — بادام — انگور کے باغ — پروسیسنگ کی صنعتیں۔

اس منظر میں مہاجر عورت اس زنجیر کی آن دیکھی محرک قوت ہے۔ وہ میکسیکو سے آتی ہیں، وسطی امریکہ سے، ایسی غریب برادریوں سے جن کے پاس کوئی حقیقی متبادل نہیں۔ بہت سی بغیر کاغذات کے ہیں، دوسروں کے کاغذات کمزور ہیں، اور سب کی حالت ایک ہے: ان کا وجود اس پر منحصر ہے کہ وہ کوئی مسئلہ کھڑا نہ کریں۔

وہ کھیتوں میں کام کرتی ہے، گرین ہاؤسز میں، پیکنگ کے کارخانوں میں۔ تھکا دینے والی شفٹیں، جھکی کمر، شدید گرمی، ہوا میں کیڑے مار دوائیں، باریک اور مسلسل نگرانی۔ وہ کم بولتی ہے، بہت دیکھتی ہے، سب کچھ سنتی ہے۔

اجرت کم ہے، اکثر حقیقی کم از کم سے بھی نیچے۔ اوور ٹائم ہمیشہ درج نہیں ہوتا۔ بیماری کی چھٹی کا کوئی تحفظ نہیں: جو کام سے غیر حاضر ہو اس کی جگہ کوئی اور لے لیتا ہے۔

تشدد عام ہے مگر اکثر درج نہیں ہوتا: - کام پر ہراسانی - جنسی بلیک میلنگ - نوکری چھن جانے کی دھمکی - حکام کو رپورٹ کرنے کی دھمکی۔

شکایت کرنے کا مطلب ہے سب کچھ کھو دینے کا خطرہ۔ چپ رہنے کا مطلب ہے بچوں کے لیے گھر کچھ نہ کچھ لاتے رہنا۔

اس کی غیر موجودگی ادارہ جاتی ہے: وہ سرکاری اعداد و شمار میں نظر نہیں آتی، اس کی کوئی نمائندگی نہیں، وہ ان بحثوں میں شریک نہیں جہاں زراعت کے فیصلے ہوتے ہیں، اور جب ماحولیاتی تبدیلی یا پائیدار سپلائی چین پر بات ہوتی ہے تو اس سے مشورہ نہیں کیا جاتا۔

وہ وہ عورت ہے جو پوری قوم کی خوراک تھامے ہوئے ہے مگر سرکاری کہانی میں جگہ کا حق نہیں رکھتی۔

کیلیفورنیا خود کو "سبز" کہہ کر بیچتا ہے، ماحول، صحت اور مستقبل کا فکرمند۔ مگر اس کے زرعی قلب کے کھیتوں میں عورتیں ایسے حالات میں کام کرتی ہیں جو ہر نعرے کو جھٹلا دیتے ہیں۔

امیج انڈسٹری کی عورت - 32 برس

ہالی وڈ، ٹیلی وژن اسٹوڈیوز، ڈیجیٹل پلیٹ فارمز، ایجنسیاں، اشتہارات، سوشل میڈیا۔ کیلیفورنیا نے تصویر پر مبنی ایک عالمی معیشت کھڑی کی ہے۔ اس مشینری کے مرکز میں وہ عورت ہے جسے سطح کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

اداکارہ، ایکسٹرا، ماڈل، انفلوئنسر، پس منظر کا چہرہ۔ اس کی پہلی پرکھ اخلاقی، ثقافتی یا پیشہ ورانہ نہیں: جمالیاتی ہے۔

"عورتوں کے کرداروں" کی مخصوص قسمیں ہیں: - اشتہارات کے لیے نوجوان عورت - خاندانی مہمات کے لیے "عام" عورت - کچھ ہدف کے لیے حد سے زیادہ جنسی بنایا گیا جسم - دوسروں کے لیے تسلی دینے والا چہرہ۔

کاسٹنگ صرف انتخاب نہیں: یہ ایک ثقافتی چھلنی ہے۔ یہ طے کرتی ہے کون دکھانے کے قابل ہے، کون بکنے کے قابل ہے، اور کون رد کرنے کے قابل۔

کھلے اور چھپے تقاضے ہمیشہ ایک جیسے ہیں: - ایک خاص وزن میں سمانا - میک اپ، ٹچ اپ، تبدیلیاں قبول کرنا - گھسے پٹے اسکرپٹس کے مطابق ڈھلنا - پیسے دینے والوں کی بات نہ کاٹنا۔

جو بھی کچھ مناظر یا حالات سے انکار کی کوشش کرے اسے "مشکل" سمجھا جاتا ہے۔ جو زیادتی یا بلیک میلنگ کی شکایت کریں انہیں الگ کر دیا جاتا ہے، ان پر ٹھپا لگا دیا جاتا ہے، اور اکثر ان کی جگہ خاموشی لے لیتی ہے۔

بڑی عالمی مہمات ہاڈی پازٹیویٹی، احترام، خود مختاری اور شمولیت کی بات کرتی ہیں۔ مگر دفاتروں کی راہداریوں میں، کاسٹنگ میں اور پروڈکشن میٹنگوں میں اصل معیار پرانے، گھٹیا اور پرتشدد ہی رہتے ہیں۔

یہاں عورت تصویر کے طور پر حد سے زیادہ نظر آتی ہے اور ایک آزاد فرد کے طور پر آن دیکھی ہے۔

اس کی غیر موجودگی نفسیاتی ہے: وہ اپنے آپ سے کٹی ہوئی ہے، ایک برانڈ میں بدل دی گئی ہے، اپنی قدر کو اعداد میں ناپنے پر مجبور: ویوز، لائکس، فالوورز، انگیجمنٹ۔

بل بورڈ پر چھپے ہر مکمل چہرے کے پیچھے ایک انسان ہے جس کا اپنی نمائندگی پر اکثر تقریباً کوئی اختیار نہیں ہوتا۔

بے گھر عورت - 50 برس

کیلیفورنیا میں امریکہ کی سب سے بڑی بے گھر آبادیوں میں سے ایک بھی ہے۔

پلوں کے نیچے خیمے، نہروں کے کنارے عارضی کیمپ، گاڑیوں میں رہتے لوگ، خستہ حال کیمپر، اور رہائشی راہداریوں میں بدلے ہوئے فٹ پاتھ۔ لاس اینجلس، سان فرانسسکو، اوکلینڈ، سان ڈیاگو: غربت ہر جگہ ہے، دکھائی دیتی ہے اور نظر انداز کی جاتی ہے۔

بے گھر عورت دوہری طرح غیر محفوظ ہے: - ایک غریب عورت کے طور پر - ایک کمزور نسوانی جسم کے طور پر۔

اکثر اس کی کہانی میں ہوتا ہے: - ناقابل برداشت کرائے - کھوئی ہوئی نوکریاں - تباہ کن علیحدگیاں - گھریلو تشدد - بغیر علاج کے صحت کے مسائل - بے حسی کی دوا کے طور پر استعمال ہونے والی لٹیں۔

رات کبھی آرام نہیں ہوتی: یہ دفاع ہے۔ چند چیزوں کی حفاظت، ایک سلیپنگ بیگ، ایک تھیلا، ایک دستاویز، ایک یاد۔ سماجی خدمات موجود ہیں، مگر وہ ہیں: - سست - ناکافی - دفتری - کبھی کبھی ذلت آمیز۔

بے گھر عورتیں درست اعداد و شمار سے بچ نکلتی ہیں: یہی وہ ہیں جو جگہ بدلتی رہتی ہیں، حملوں سے بچنے کے لیے ٹھکانے بدلتی ہیں، ڈر کی وجہ سے پناہ گاہوں میں نہیں جاتیں، اپنے بچوں کو خدمات کے پاس نہیں لاتیں اس خوف سے کہ وہ ان سے چھین لیے جائیں گے۔

اس کی غیر موجودگی اخلاقی ہے: معاشرہ اسے دیکھتا ہے مگر اپنا حصہ تسلیم نہیں کرتا۔ اسے ایک مسئلہ کہا جاتا ہے، کبھی سیاسی اور معاشی فیصلوں کا نتیجہ نہیں۔

کیلیفورنیا، جو ڈیجیٹل شمولیت، جدت اور پائیدار مستقبل کی بات کرتا ہے، ان عورتوں کے ساتھ رہتا ہے جو عوامی فواروں میں بال دھوتی ہیں، جو پارکنگ میں کپڑے بدلتی ہیں، جو لنگر خانے کی بدولت کھاتی ہیں۔

ان میں سے کوئی بھی ”انتہائی معاملہ“ نہیں۔ وہ ایک ایسے ماڈل کا معمول کا نتیجہ ہیں جو ان لوگوں کے زوال کو ناگزیر مان لیتا ہے جو زندگی کی قیمت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔

اختتامیہ - کیلیفورنیا

کیلیفورنیا دنیا کا شوکیس ہے اور ساتھ ہی اس کا پچھلا کمرہ بھی۔

باہر سے نمائش: - ٹیکنالوجی- سنیما- موسیقی- یونیورسٹی- جدت

اندر سے یہ چھپاتا ہے: - زرعی استحصال - جائیداد کی عدم مساوات - انتہائی بے یقینی - لٹیں - ڈھانچہ جاتی بے گھری۔ یہاں عورتیں اپنی کمی کی وجہ سے غیر حاضر نہیں۔ وہ تصویروں کی بھرمار کی وجہ سے غیر حاضر ہیں۔

جب کوئی جگہ ہر طرف مسلسل عورتوں کے جسم دکھاتی ہے — اسکرینیں، بل بورڈ، ویڈیوز، اشتہار، سوشل میڈیا کی فیڈز— تو وہ دنیا کو یہ فریب دیتی ہے کہ عورتیں مرکز میں ہیں۔

حقیقت میں: - ٹیکنالوجی میں کام کرنے والی عورت کم ہی حکم چلاتی ہے - کھیتوں کی مہاجر کی بات نہیں سنی جاتی - تصویر کی پیشہ ور کو پہلے سے بنے کرداروں میں دبا دیا جاتا ہے - بے گھر عورت سے نظریں چرا لی جاتی ہیں۔

کیلیفورنیا ثابت کرتا ہے کہ غیر موجودگی صرف خلا نہیں: یہ حقیقی طاقت کے بغیر حد سے زیادہ نمائندگی بھی ہو سکتی ہے۔

یہ وہ ریاست ہے جہاں عورتیں ہر جگہ نظر آتی ہیں مگر اس سے کہیں کم تسلیم کی جاتی ہیں جتنا دنیا سوچتی ہے۔

غور و فکر - کیلیفورنیا

الاسکا میں غیر موجودگی پالا ہے۔ الاباما میں یہ تاریخ ہے۔ ایریزونا میں یہ سرحد پر ہے۔ کیلیفورنیا میں یہ میک اپ ہے۔

یہاں عورتوں کی غیر موجودگی کو چھپایا جاتا ہے: - ترقی پسند نعروں سے - درست اشتہاری مہمات سے - برابری پر کانفرنسوں سے - حوصلہ افزا

کہانیوں سے۔

ہم ”شمولیت“ کی بات کرتے ہیں، مگر حقیقی شمولیت تین ٹھوس پیمانوں سے ناپی جاتی ہے: - کون فیصلہ کرتا ہے - کسے زیادہ تنخواہ ملتی ہے - کون انکار کرنے کی گنجائش رکھتا ہے۔

ان تین نکات پر کیلیفورنیا کی عورتیں - ہر سماجی طبقے میں - بہت بار پیچھے رہ جاتی ہیں:

- منیجر کو تب تک برداشت کیا جاتا ہے جب تک وہ پوری طاقت نہ مانگے - مہاجر کو تب تک رہنے دیا جاتا ہے جب تک وہ احتجاج کیے بغیر سخت کام سہہ سکے - تصویر کی پیشہ ور کو تب تک استعمال کیا جاتا ہے جب تک وہ ہدف کے مطابق ہو - بے گھر عورت کو تب تک نظر انداز کیا جاتا ہے جب تک وہ ٹریفک یا شائستگی میں رکاوٹ نہ بنے

دنیا مستقبل کو سمجھنے کے لیے کیلیفورنیا کو دیکھتی ہے۔ مگر اگر وہ واقعی ان عورتوں کو دیکھے جو اسے سنبھالے ہوئے ہیں، تو ایک سادہ سچ دریافت کرے گی:

اس جگہ کا کوئی مستقبل نہیں جو اس غیر موجودگی کو معمول بنا لے
جو اسے تھامے ہوئے ہیں۔

اسی لیے کیلیفورنیا اس جلد میں شامل ہے۔ ایک افسانے کے طور پر نہیں، ایک پوسٹ کارڈ کے طور پر نہیں، ایک دشمن کے طور پر نہیں۔ ایک ثبوت کے طور پر۔

دنیا میں تخیل کے دارالحکومتوں میں سے ایک، جہاں سب سے مشکل چیز دیکھنا ہمیشہ وہی رہتی ہے: ان عورتوں کی حقیقی زندگیاں جو کبھی اسکرین پر نہیں آتیں۔

کولوراڈو

کولوراڈو ایک ایسی ریاست ہے جو سادہ ہونے کا دکھاوا کرتی ہے مگر ہے نہیں۔ یہ وہ امریکہ ہے جو دو انتہاؤں کے بیچ جیتا ہے:

- پہاڑ جو حفاظت لگتے ہیں - شہر جو سماجی تجربہ گاہوں کی طرح کام کرتے ہیں

یہ ایک صاف ستھرا، منظم، بظاہر ترقی پسند علاقہ ہے، مگر بہت واضح تضادات کے ساتھ: زندگی کی انتہائی ناقابل برداشت قیمت، آن دیکھی علیحدگی، تکنیکی کام، بند رہائشی بستیاں، اور خاموش سماجی تنہائی۔

یہاں عورتیں کھلے تشدد کی وجہ سے غائب نہیں ہوتیں۔ وہ حد سے زیادہ نظم، ثقافتی دباؤ اور دم گھونٹ دینے والی سماجی توقعات کی وجہ سے غائب ہوتی ہیں۔

کولوراڈو ایک ایسی ریاست ہے جو بہت مانگتی ہے اور کم لوٹاتی ہے۔ یہاں رہنے والی عورتیں ایک مشکل توازن قائم رکھتی ہیں:

- تکنیکی اور ذہنی کام - خاندان جو پوری موجودگی مانگتے ہیں - برادریاں جو دیکھتی اور پرکھتی ہیں - ذہنی صحت جس کے لیے جگہ نہیں - جغرافیائی تنہائی جو "معیار زندگی" کا روپ دھارے ہوئے ہے۔

یہ ایک ایسی ریاست ہے جہاں تم اس لیے نہیں گرتیں کہ کوئی تمہیں دھکا دیتا ہے۔ تم اس لیے گرتی ہو کہ کوئی تمہیں پھسلتے نہیں دیکھتا۔

ڈینور کی عورت - 35 برس

ڈینور جدید، کارآمد اور صاف ستھرا ہے۔ ہر کوئی ٹیکنالوجی، اسٹارٹ اپس اور معیار زندگی کی بات کرتا ہے۔ مگر عملاً یہ ایک ایسا شہر ہے جو عورتوں سے بہت مانگتا ہے اور بدلے میں غیر معمولی حد تک کم دیتا ہے۔

وہ ایک پیشہ ور ہے: - ڈگریاں - تکنیکی مہارتیں - مستحکم نوکری - درمیانے سے اونچی تنخواہ۔

سب کچھ مکمل ہے، کاغذ پر۔

وہ مسلسل دباؤ میں جیتی ہے: کارکردگی، اہداف، میٹنگیں، پروجیکٹ مینجمنٹ، ہر ہفتے ناپے جانے والے نتائج۔

کمپنیاں کام اور زندگی کے توازن کی بات کرتی ہیں۔ مگر ہر وقت دستیابی مانگتی ہیں۔

اس کے پاس مہنگا اپارٹمنٹ ہے، بھرا ہوا شیڈول، اور باریکی سے منظم زندگی۔ وہ غربت سے نہیں گر رہی: وہ تھکن سے گر رہی ہے۔

اس کی غیر موجودگی ذہنی ہے۔ وہ ہمیشہ کام کرتی ہے، ہمیشہ سوچتی ہے، سب کچھ جوڑے رکھتی ہے—یہاں تک کہ کچھ ٹوٹ جاتا ہے۔ اور جب ٹوٹتا ہے تو خاموشی سے ٹوٹتا ہے۔

پہاڑوں کی استاد - 42 برس

ڈینور اور بولڈر سے باہر کولوراڈو کا چہرہ بدل جاتا ہے۔ پہاڑ، چھوٹی برادریاں، ایسے قصبے جہاں سردیوں میں کم لوگ رکتے ہیں اور گرمیوں میں سیاح تصویریں کھینچنے امد آتے ہیں۔

یہاں استاد اس علاقے کا ستون ہے: - وہ پڑھاتی ہے - وہ رہنمائی کرتی ہے - وہ ساتھ دیتی ہے - وہ سب کو جانتی ہے - وہ نفسیاتی سہارا ہے - وہ بچوں کے لیے ایک بڑا خاندان ہے۔

وہ برف، الگ تھلگ سڑکوں اور چھوٹے اسکولوں کے بیچ رہتی ہے۔ اس کا کام ہے پناہ ہے، تنخواہ محدود۔

اس کی غیر موجودگی ادارہ جاتی ہے: وہ برادری کو سنبھالتی ہے مگر سیاسی فیصلوں میں کبھی شریک نہیں ہوتی۔ وہ وہ عورت ہے جو پورے علاقے کو سہارا دینے کے لیے کام کرتی ہے مگر تسلیم نہیں کی جاتی۔

مقامی باشندوں کی ریزرویشن کی عورت - 30 برس

کولوراڈو کا "آن دیکھا" حصہ اس کی ریزرویشنز ہیں۔ ایسے علاقے جہاں تاریخ جدیدیت سے زیادہ بھاری ہے۔

مقامی عورتیں جبر کی تین سطحیں جھپکتی ہیں: - ڈھانچہ جاتی غربت - اندرونی پدرسری ثقافت - باہر کے اداروں کا چھوڑ دینا۔

وہ اکثر سماجی پروگراموں، قبائلی اسکولوں اور انتہائی معمولی صحت مراکز میں کام کرتی ہے۔ وہ لت، ڈپریشن، گھریلو تشدد اور ایک ایسے جغرافیائی فاصلے سے لڑتی ہے جو مکمل طور پر الگ کر دیتا ہے۔

اس کی غیر موجودگی ثقافتی ہے: جدید کولوراڈو اسے اپنی شناخت کا حصہ نہیں سمجھتا، اور اس کی اپنی برادری ہمیشہ اس کا خود کو نئے سرے سے بنانے کا حق تسلیم نہیں کرتی۔ وہ ایک ایسی عورت ہے جو پوری قوم کو سنبھالے ہوئے ہے جبکہ دنیا اسے نظر انداز کرتی ہے۔

اسکی ریزورٹ کی عورت - 27 برس

ایسپن، ویل، بریکنرج، ٹیلورائیڈ۔ عیش، پیسہ، سرمائی کھیل، موسمی معیشت۔

یہاں کام کرنے والی عورت - ویٹرس، بارٹینڈر، لفٹ آپریٹر، ریسپیشنسٹ، انسٹرکٹر - ایک دوہری دنیا میں جیتی ہے:

- غیر معمولی حد تک امیر سیاح - وہ مزدور جو سب کچھ تھامے ہوئے ہیں وہ بغیر مقررہ اوقات کے کام کرتی ہے، کم تنخواہ پر، اور اکثر عارضی طور پر۔ کرایہ ادا کرنے کے لیے دوسری مزدوروں کے ساتھ ننھے کمرے بانٹتی ہے۔ وہ دولت میں گھری ہے، پھر بھی الگ تھلگ ہے۔ اسے مغرور سیاحوں، موسمی منیجروں اور مسلسل تقاضوں سے نمٹنا پڑتا ہے۔

اس کی غیر موجودگی معاشی ہے: وہ سب کے لیے دولت پیدا کرتی ہے مگر خود غریب رہتی ہے۔

اختتامیہ - کولوراڈو

کولوراڈو ایک ایسی ریاست ہے جو مکمل لگتی ہے، مگر بے نہیں۔ یہ منظم، امیر، جدید اور سماجی طور پر متوازن ہے—کاغذ پر۔ مگر اس کی عورتیں تین فالٹ لائنوں پر جیتی ہیں:

- ذہنی دباؤ - علاقائی تنہائی - اداروں کی غیر موجودگی
کوئی اسکینڈل نہیں، تشدد کے بڑے واقعات نہیں، کوئی افراتفری نہیں۔ اور ٹھیک اسی وجہ سے ان کی غیر موجودگی اور بھی بھاری ہے۔
یہاں عورتیں اس لیے نہیں گرتیں کہ کوئی انہیں دھکا دیتا ہے۔ وہ اس لیے گرتی ہیں کہ سب فرض کر لیتے ہیں کہ وہ سنبھل جائیں گی۔

غور و فکر - کولوراڈو

کولوراڈو کی عورتوں کی طاقت شور مچانا نہیں۔ اور نہ ہی خبر بننا۔
یہ ایک باریک، جدید، ذہین غیر موجودگی ہے۔ پہچاننا مشکل، نظر انداز کرنا آسان۔

کولوراڈو ایک سادہ بات سکھاتا ہے: غیر موجودگی صرف غربت، تشدد، سردی یا قید نہیں۔ یہ منظم بھی ہو سکتی ہے۔ یہ خوشحالی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ توقع بھی ہو سکتی ہے۔

جب ایک عورت افراطی سے نہیں بلکہ ”سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے“ سے کچلی جاتی ہے، تو مسئلہ نظر نہیں آتا - مگر وہ حقیقی ہے۔

اور اسی لیے کولوراڈو بھی یہاں ہے: یہ یاد دلانے کے لیے کہ عورت کی غیر موجودگی کا صرف ایک چہرہ نہیں۔ اس کے پچاس چہرے ہیں۔ ہر ریاست کا ایک۔

کنیکٹیکٹ

کنیکٹیکٹ ایک ایسی ریاست ہے جس کا تصور بہت سے کرتے ہیں مگر کم ہی اسے واقعی جانتے ہیں۔ باہر سے یہ نفیس ہے: بے داغ قصبے، صاف مضافات، بہترین اسکول، مہنگا پٹرول، صاف فٹ پاتھ، مکمل لان والے گھر۔ یہ امریکہ کا ”اونچا“ رخ ہے، وہ جو کبھی آواز بلند نہیں کرتا، وہ جو منظم کرتا ہے، حکومت کرتا ہے اور انتظام سنبھالتا ہے۔

یہاں سب کچھ توازن میں لگتا ہے، مگر یہ توازن فطری نہیں: یہ ایک مسلسل دباؤ ہے، شائستگی کی، ظاہری صورت کی، توقع کی مسلسل دیکھ بھال۔

کنیکٹیکٹ تم سے چمکنے کو نہیں کہتا۔ یہ کہتا ہے کہ کبھی غلطی نہ کرو۔
یہ ایک ایسی ریاست ہے جہاں اچھی زندگی گزاری جا سکتی ہے اگر صرف تین چیزیں سچ ہوں: - سماجی مقابلہ - جذباتی قابو - برادریوں کا خاموش فیصلہ

یہاں عورتیں غربت یا کھلے تشدد کی وجہ سے غائب نہیں ہوتیں۔ وہ زبردستی کی مطابقت کی وجہ سے غائب ہوتی ہیں۔ ایک شائستہ گمشدگی: بغیر شور، بغیر اسکیڈل، بغیر خبر کے۔

یہ ایک نفیس غیر موجودگی ہے، مگر پھر بھی غیر موجودگی۔

انشورنس دفتر کی خاتون - 40 برس

کنیکٹیکٹ امریکہ کا انشورنس دارالحکومت ہے۔ ہارٹ فورڈ ہر جگہ اس کا اعلان کرتا ہے: "Insurance Capital of the World".

ان نعروں کے پیچھے ہزاروں عورتیں ہیں جو کبھی نہ ختم ہونے والی اسکرینوں کے سامنے بیٹھی ہیں: - شکایات - پالیسیاں - خطرے کے الگورتھم - ڈیجیٹل کاغذی کارروائی - طریقہ کار - پیمائشیں۔

ان کا کام درست، تکنیکی اور باریکی سے منظم ہے۔ ہر غلطی کمپنی کو پیسے اور انہیں وقت کی قیمت چکاتی ہے۔ ہر فیصلے کا جواز دینا، دستاویزی بنانا، منظور کرانا اور تصدیق کرانا ضروری ہے۔

دن نگرانی کی ایک زنجیر ہے۔

وہ سب کچھ جوڑے رکھتی ہے کیونکہ نظام اس سے بے عیب ہونے کی توقع رکھتا ہے۔ اور تنخواہ اچھی ہے: دوسرے ملکوں کے مقابلے میں بہترین۔

مگر جذباتی قیمت انتہائی زیادہ ہے۔

یہاں عورتیں ڈھیر نہیں ہوتیں۔ وہ آہستہ آہستہ، بغیر کوئی آواز کیے، خالی ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ ان دفاتروں میں کوئی نہیں پوچھتا کہ تم کیسی ہو۔ وہ بس پوچھتے ہیں، "کام کیسا چل رہا ہے؟"

اس کی غیر موجودگی ذہنی ہے: ہر روز موجود مگر اپنے آپ سے کٹی ہوئی۔

امیر مضافات کی عورت - 45 برس

کنیکٹیکٹ کا امیر حصہ ایک الگ دنیا ہے۔ بڑے بڑے گھر، خاموش SUV گاڑیاں، مکمل باغ، نجی اسکول، پرانے سماجی ضابطے۔

یہاں عورتیں ہمیشہ ”باہر“ کام نہیں کرتیں: وہ سماجی نظام کے اندر کام کرتی ہیں۔

اس کا کردار ثقافتی ہے: - بے عیب ماں - ہم آہنگ بیوی - کمیٹیوں میں موجودگی - گھر کا انتظام - طے شدہ رضاکاری - مکمل تصویر۔

اگر وہ بکھر جائے تو کہہ نہیں سکتی۔ اگر ناخوش ہو تو دکھا نہیں سکتی۔ اگر اکیلی ہو تو کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔

اس کی غیر موجودگی شناخت کی علامت ہے: وہ اس کردار کے پیچھے غائب ہو جاتی ہے جو اسے نبھانا ہے۔

ایک ایسی جگہ جہاں ”سب کچھ مکمل ہے،“ وہ کوئی دراڑ دکھانے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

یہ ایک نفیس قید خانہ ہے، مگر پھر بھی قید خانہ۔

اشرافیہ یونیورسٹی کی عورت - 34 برس

نیو یون میں دنیا کی سب سے معتبر یونیورسٹیوں میں سے ایک ہے: Yale۔

تعلیمی ماحول ترقی پسند، جدید اور توجہ دینے والا لگتا ہے۔ مگر سطح کے نیچے سختی، شدید مقابلہ اور آسمان کو چھوتی توقعات ہیں۔

محقق عورت ایک تضاد میں جیتی ہے: - وہ پڑھی لکھی ہے - وہ قابل ہے - وہ تیار ہے - وہ ثقافتی پیداوار کا مرکز ہے۔

مگر نظام اسے کچل بھی دیتا ہے۔

اشاعتیں، کانفرنسیں، گرانٹس، مضامین، رہنمائی، تدریس، اندرونی تعلقات۔ ایک مسلسل مشقت جو زندگی، ذہن اور جسم میں سرایت کر جاتی ہے۔

ساتھی عورتیں اکثر حریف ہوتی ہیں۔ مرد ساتھی اب بھی تاریخی کرسیوں پر قابض ہیں۔

اس کی غیر موجودگی ادارہ جاتی ہے: جو علم وہ پیدا کرتی ہے وہ یونیورسٹی کو سہارا دیتا ہے، مگر اس کا کیریئر زیادہ آہستہ، زیادہ غیر یقینی، زیادہ معلق آگے بڑھتا ہے۔

بہت سی ڈٹی رہتی ہیں۔ بہت سی چھوڑ جاتی ہیں۔

Yale مکمل رہتی ہے۔ وہ نہیں۔

ملی جلی بستیوں کی عورت - 31

برس کی

امیر مضافات سے باہر اور اشرافیہ یونیورسٹیوں سے دور اصل کنیکٹیکٹ ہے: کم اجرتیں، اونچے کرائے، عارضی نوکریاں، ملی جلی برادریاں، اور ایک سماجی نظام جو ہمیشہ کام نہیں کرتا۔

یہاں عورتیں چھپا ہوا ستون ہیں: وہ سپر مارکیٹوں، سرکاری اسکولوں، گروپ ہومز، فلاحی خدمات، چھوٹے کاروباروں اور بنیادی صحت میں کام کرتی ہیں۔ سب کچھ تھامے رکھتی ہیں: کم تنخواہ والی نوکری - بچے - بڑا خاندان - سست پبلک ٹرانسپورٹ - مسلسل دباؤ۔

اس کی غیر موجودگی معاشی ہے: وہ بہت کام کرتی ہے، کم کماتی ہے، اور آگے نہیں بڑھتی۔

اور وہ ایک حیران کن تضاد میں جیتی ہے: وہ امریکہ کی امیر ترین ریاستوں میں سے ایک میں رہتی ہے مگر خود کو دولت کا حصہ محسوس نہیں کرتی۔

کیونکہ یہاں دولت نجی ہے، سماجی نہیں۔

اختتامیہ - کنیکٹیکٹ

کنیکٹیکٹ "محفوظ"، "صاف"، "مستحکم" لگتا ہے۔ اور کچھ لحاظ سے ہے بھی۔

مگر یہ ان ملکوں میں سے بھی ہے جہاں عورتیں سب سے آسانی سے بغیر آواز کے غائب ہو جاتی ہیں۔ تشدد کی وجہ سے نہیں، بھوک کی وجہ سے نہیں، سردی کی وجہ سے نہیں۔ سماجی توقع کی وجہ سے۔

یہ ایک ہموار سطح کی کمی ہے: کوئی افراتفری نہیں، کوئی چیخ نہیں، کوئی متاثر کن اعداد و شمار نہیں۔ بس اونچے تقاضوں اور کم صلے سے

کچلی ہوئی زندگیاں۔

کسی کو پتا نہیں چلتا کیونکہ سب کچھ کام کر رہا ہے۔ اور ٹھیک یہی چیز اسے خطرناک بناتی ہے۔

غور و فکر - کنیکٹیکٹ

بہت سی ریاستوں میں غیر موجودگی نمایاں ہے۔ یہاں یہ محتاط ہے۔ شائستہ۔ "عام۔" کنیکٹیکٹ دکھاتا ہے کہ ایک عورت کے پاس ہو سکتا ہے: ایک گھر، ایک نوکری، ایک آمدنی، ایک محفوظ محلہ، ایک معزز برادری۔

اور ساتھ ہی ایک انسان کے طور پر بالکل آن دیکھی رہنا۔

سماجی کاملیت ایک باریک بلیڈ ہے۔ یہ تم سے مسکرانے کو کہتی ہے جبکہ تمہاری جگہ چھین لیتی ہے۔

کنیکٹیکٹ سکھاتا ہے کہ غیر موجودگی بہت زیادہ نظم، بہت زیادہ شائستگی، بہت زیادہ قابو سے بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

اور یہ کہ کوئی معاشرہ تب تک واقعی ترقی یافتہ نہیں جب تک وہ عورتوں کو کامل ہوئے بغیر موجود رہنے کی اجازت نہ دے۔

ڈیلاویئر

ڈیلاویئر ایک پھسلنی ریاست ہے۔ چھوٹی، پرسکون، اور مالی طور پر تنگ۔ یہ ایک چھوٹی سی تفصیل لگتی ہے، مگر امریکہ کے کام کاج کا ایک اہم حصہ ہے۔

یہاں نہ دیو بیکل میٹروپولیس ہیں، نہ صحرا، نہ پہاڑ، نہ چکاچوند آئینے۔ یہاں ایک چھپی ہوئی معیشت ہے، محتاط سیاست، ایک دفتر شاہی جو خاموشی سے اربوں ادھر ادھر کرتی ہے۔

ڈیلاویئر وہ جگہ ہے جہاں امریکہ اپنی کمپنیاں رجسٹر کرتا ہے، اپنا پیسہ رکھتا ہے اور اپنے حساب چکاتا ہے۔ بیج کی ایک جگہ: نہ بہت امیر، نہ بہت غریب، نہ بہت شور والی۔

یہ ایک مکمل سرمئی علاقہ ہے۔

ڈیلاویئر میں عورت کی غیر موجودگی پھٹتی نہیں۔ یہ بھاپ بن کر اڑ جاتی ہے۔ آہستہ، مسلسل، اعداد میں اور عوامی گفتگو میں آن دیکھی۔ یہاں عورتیں خاموش بوجھ کی وجہ سے غائب ہوتی ہیں، ایسی نوکریوں کی وجہ سے جو اتنی چھوٹی ہیں کہ گنی نہیں جاتیں، ایسے کرداروں کی وجہ سے جو کبھی قومی کہانی میں داخل نہیں ہوتے۔

کارپوریٹ دفتر کی خاتون - 38 برس

ڈیلاویئر دس لاکھ سے زیادہ امریکی کمپنیوں کا قانونی گھر ہے۔ یہ کارپوریٹ دستاویزات، انضمام، ٹرسٹ، ملکیت کی تبدیلیاں، ٹیکس کے کاغذات اور اربوں کے لین دین محفوظ کرتا ہے۔

دنیا سوچتی ہے کہ یہ کام بڑے منیجر کرتے ہیں۔ یہ کام وہ عورتیں کرتی ہیں جو بغیر کھڑکی کے کیوبیکلز میں بیٹھی دستاویزات کے نہ ختم ہونے والے دھارے سنبھالتی ہیں۔

وہ ایک منظم دفتر میں کام کرتی ہے، قواعد، طریقہ کار اور جانچ سے بھرا ہوا۔ وہ تقریباً کبھی غلطی نہیں کرتی کیونکہ ایک غلطی لاکھوں کی پڑ سکتی ہے۔ وہ تیز ہے، درست ہے، اور آن دیکھی ہے۔

اس کا دن بنا ہے: فارموں، دستخطوں، ضابطوں، جانچ، ای میلز، چیک لسٹوں سے۔

اس کا کام پورے معاشی نظام کو سہارا دیتا ہے۔ مگر کوئی اسے نہیں دیکھتا۔ کوئی اسے تسلیم نہیں کرتا۔ کوئی اس کی بات نہیں کرتا۔

اس کی غیر موجودگی ڈھانچہ جاتی ہے: وہ کاغذ کی ایک سلطنت کو سنبھالے رکھتی ہے مگر طاقت کی کہانیوں میں کبھی نظر نہیں آتی۔

گودام اور لاجسٹکس کی عورت - 33 برس

ڈیلاویئر صرف دفتر شاہی نہیں۔ یہ ایک بندرگاہ بھی ہے، مال برداری، گودام اور سپلائی چینز۔

یہاں عورت کام کرتی ہے: - ریفریجریٹڈ گوداموں میں - چھانٹی کے مراکز میں - صنعتی گوداموں میں - خوراک کی کمپنیوں میں - رات کی رابطہ

کاری میں۔ بھاری شفٹیں، تیز رفتار، جھکی کمریں، ٹھنڈی ہوا۔ بار بار کی حرکتیں، چوٹ کا خطرہ، مسلسل نگرانی۔

اس کی تنخواہ کم ہے۔ اس کا معاہدہ اکثر عارضی ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی گنجائش نہیں۔

اس کی غیر موجودگی معاشی ہے: وہ سخت محنت کرتی ہے، کم کماتی ہے، اور کبھی آگے نہیں بڑھتی۔

یہ وہ عورت ہے جو تجارت کا چھپا ہوا حصہ تھامے ہوئے ہے جبکہ دنیا صرف بڑے شہروں کو دیکھتی ہے۔

بنیادی صحت کی دیکھ بھال کی عورت - 47 برس

ڈیلاویئر کے پاس صحت کا کوئی دیو ہیکل نظام نہیں۔ اس کے پاس بنیادی دیکھ بھال کا ایک کم سے کم اور انتہائی نازک جال ہے۔

یہاں عورت سنبھالتی ہے: - بڑھاپے کے گھر- چھوٹے کلینک- برادری کے شفاخانے- گھر پر دیکھ بھال- تنہا بزرگوں کی مدد- بھولے ہوئے دائمی مریض۔

اس کا کام جذباتی، جسمانی اور مسلسل ہے۔ وہ اس سے زیادہ دکھ دیکھتی ہے جتنا سہہ سکتی ہے۔ وہ بغیر اعتراف کے زائد گھنٹے کام کرتی ہے۔ وہ اپنے حق سے کم کماتی ہے۔

اس کی غیر موجودگی سماجی ہے: وہ ریاست کی جگہ لیتی ہے جہاں ریاست نہیں پہنچ سکتی، مگر کوئی ایسے نظام کا لازمی حصہ نہیں سمجھتا۔

جب وہ نہیں ہوتی تو سب کچھ بکھر جاتا ہے۔ مگر جب وہ کام کرتی ہے تو کسی کو پتا نہیں چلتا۔

کم آمدنی والے محلے کی عورت - 29

برس کی

ڈیلاویئر کے بھی اپنے نازک حصے ہیں: غربت، گھریلو تشدد، منشیات اور بے توجہی سے نشان زدہ محلے۔ یہاں عورتیں ایک ساتھ تین مسائل کا سامنا کرتی ہیں: عارضی روزگار، بڑھتی ہوئی مہنگائی، اور کم سماجی تحفظ۔

وہ کیشیئر، صفائی والی، موسمی مزدور، آیا اور باورچی خانے کی مددگار کا کام کرتی ہے۔ وہ دوسروں کے گھر دھوتی ہے، صاف کرتی ہے، سنبھالتی ہے اور سجاتی ہے۔

اس کا دن ایک دوڑ ہے: بچے، بسیں، شفٹیں، خریداری، گھر، مسائل۔

اس کی غیر موجودگی شہری ہے: وہ ایک ایسے شہر میں رہتی ہے جو نئے جنم کی بات کرتا ہے مگر انہی عورتوں کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے جو بدترین لمحوں میں اسے سنبھالے رکھتی ہیں۔

اختتامیہ - ڈیلاویئر

ڈیلاویئر کے پاس نہ کیلیفورنیا کا ڈرامہ ہے، نہ الاسکا کا جما دینے والا درجہ حرارت، نہ جنوب کی سختی۔

اس میں کچھ مختلف ہے: معمول، آن دیکھے پن کی ایک شکل کے طور پر۔

یہاں عورتوں کا کام شور نہیں کرتا کیونکہ وہ ہے: - تکنیکی - دہرایا جانے والا - لازمی - خاموش - کہانی کے لائق کم۔

کبھی کوئی دھماکا نہیں ہوتا۔ بس مسلسل گھساؤ ہے۔

عورتیں سرخیاں نہیں بنتیں۔ وہ بڑی تعداد میں احتجاج نہیں کرتیں۔ وہ جگہ نہیں مانگتیں۔ وہ بس سہتی ہیں۔

اور ٹھیک یہی چیز انہیں آن دیکھا بناتی ہے۔

غور و فکر - ڈیلاویئر

ڈیلاویئر دکھاتا ہے کہ عورت کی غیر موجودگی ایک اور بھی زیادہ پوشیدہ شکل لے سکتی ہے: خاموشی کا مکمل انتظام۔ یہاں عورتیں محرک قوت ہیں: - دفتر شاہی کی - رابطہ کاری کی - بنیادی صحت کی - کم از کم

خدمات کی۔ پھر بھی وہ امریکہ کی کہانیوں میں کبھی نظر نہیں آتیں۔ غیر موجودگی شور نہیں۔ یہ پس منظر ہے۔ اور ڈیلاویئر اس کا ثبوت ہے: ایک ایسی جگہ جہاں ملک ہمیشہ گزر جاتا ہے، مگر عورت ہمیشہ وہیں ٹھہری رہتی ہے۔

Ferdinando Frega